ہدیہ خلوص
بخدمت جناب خواجہ منظور حسین صاحب
[illegible]

اشک و رشک غالبؔ

[illegible]

مُرتّبہ

سید ظہیر الدین احمد علوی ایم ۔ اے (فارسی) ایم ۔ اے (اُردو)

ایل ، ایل ، بی (علیگ)

شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پبلشر

نذیر اینڈ سنز

مُسلم ایجوکیشنل پریس علیگڑھ

قیمت - ۱۲ر

فہرست عنوانات

۶۸۶

عرضداشت

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

کلامِ غالب پر نقد و تبصرہ وہ بھی نئے عنوان سے خدا کرے کہ شوق کا سفینہ ساحلِ مُراد تک پہنچ جائے۔

قبل اس کے کہ میں اشک و رشکِ غالب کی پہلی سطر شروع کروں مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ میں ایک ایسے بحرِ ذخار میں شناوری کرنے کا قصد کر رہا ہوں جس کی پر حوصلہ موجوں سے مقابلہ کرنے کی قوت میرے دست و بازو میں نہیں ہے لیکن میں ہمتِ مرداں مددِ خدا کے مصداق پروردگار کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے قدم آگے بڑھاتا ہوں۔

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

دیوانِ غالب وہ گنجینۂ معانی ہے جس میں انواع و اقسام کے نقد جواہرات بھرے ہیں میری آنکھیں چکا چوند ہو رہی ہیں کاش کہ میں جوہر شناس ہوتا اور ان چمکتے ہوئے موتیوں سے اپنے جیب و دامن کو پورے طور سے بھر سکتا۔

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے   یہ غم ہے کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے   کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ

صرف چند ایسے موتیوں کی لڑیاں تیار کر رہا ہوں جن پر آنکھیں ٹھہر سکیں پھر بھی اندیشہ ہے کہ حسنِ امتیاز نے کچھ کام کیا بھی یا نہیں ممکن ہے کہ اعتدال سے کہیں پیچھے رہ گیا ہوں اور کہیں آگے بڑھ گیا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ جس خدمت کو میری جسارت نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ میری بساط سے باہر ہے ایسی حالت میں ہر قسم کا اندیشہ ممکن ہے۔

دیوانِ غالب ایک مدت سے مطالعہ میں ہے خدا جانے کہاں کہاں نگاہیں پہنچیں خیالات میں کتنی رنگا رنگ موجیں اٹھیں لیکن میں تشنہ کام صرف چند قطروں سے اپنی پیاس بجھا سکا۔

اشک و رشک کے چند موضوعات یکجا ہو گئے گویا شوق کا آنسو بچھ گیا تشنہ کامی کے گلے میں دو چار قطرے پہنچ گئے فرصت دنیا کو رشک و حسرت سے دیکھتا رہ گیا یہ بھی نہیں جانتا کہ صاحبانِ علم و دانش کے سامنے یہ بھی قابلِ تحسین یا نفرین ہے قبول ہو تو اہلِ ذوق کی نگاہوں کا فیض نہ قبول ہو تو اپنی ہیچمدانی کا صلا۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

رشک غالب میں ایسے مختلف مگر متحد الخیال عنوان کے اشعار پائے جائیں گے جن سے حضرت غالب کی اُفتادِ طبیعت کا نہایت صحیح اندازہ ہو سکے گا بخوبی معلوم ہوگا کہ ایک نادر الکلام شاعر اپنے ایک ایک خیال کو کس کس رنگ اور کس کس ترقی سے نظم کرنے کا شرف حاصل کرتا ہے۔

غالب اس خصوصیت کے مالک ہیں کہ اُن کے اُن تھک خیالات ہمیشہ ترقی پر ترقی کرتے چلے جاتے ہیں اُن کے جذبات عالیہ کا یہ حال ہے کہ دریا کی طرح بہتے اور سیلاب کی طرح پھیل جاتے ہیں شاعرانہ تصرفات میں وہ لطافتیں ہیں کہ بیان سے باہر۔ شاعری کے تمام فنون لطیفہ کے ساتھ حقائق نگاری کا وہ عالم کہ دنیائے سخن سربسجود ہوتی جا رہی ہے۔

یہ مسائل تصوّف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

خلد آشیاں حضرت نجم الدولہ دبیر الملک میرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب اکبر آبادی ثم الدہلوی کے قدر دان ڈاکٹر بجنوری نے اپنے مقدمہ کی پہلی سطر بڑی قیمتی لکھی ہے۔

" ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ایک وید دوسرا دیوان غالب "

ڈاکٹر موصوف نے بظاہر ایک بڑی جسارت سے کام لیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت غالب کا پاکیزہ کلام دیکھنے اور سمجھنے والے تعریف و توصیف میں اس سے بھی زیادہ سحر بیانی کرنے کے مستحق ہیں۔

میں ڈاکٹر صاحب کی طرح نہیں کہتا کہ دیوان غالب ہندوستان کی الہامی کتاب ہے لیکن اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ دیوان غالب ہندوستان اور دنیائے ادب اردو کے لئے وہ مقدس دستاویز ہے جس کی تکمیل میں قدرت کی مہربانیاں بڑی حد تک شامل ہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ غالب تلامیذ الرحمان کی صف اول میں نمایاں جگہ نہیں رکھتے ان کے ہوش آفریں تخیلات کی سیر کرنے والا ان کی معراج کلام تک اپنے ذہن کو رسائی دینے والا مجبور ہے یہ کہنے پر کہ "زبان غالب حکم ناطق" غالب کے بلند پایہ اشعار میں علم و حکمت کی تجلیاں ہیں جو صفحۂ قرطاس کو بے تکلف وادیٔ ایمن بناتی ہیں۔

شاعر نہ نبی ہوتا ہے نہ پیمبر نہ اسے الہام ہوتا ہے نہ وحی نہ وہ علم غیب سے واسطہ رکھتا ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ عالم الغیب کا شاگرد اور ملک اَلَست کے مدرسہ الہیات کا طالب العلم ہوتا ہے۔ اس کے تیز احساسات بلند خیالات عالم غیر معلوم تک کے حالات ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

عالم امکان میں جن اشیاء کو ہمارے پیکِ نظر غیر محسوس طریقہ پر دن رات دیکھتے اور کچلتے پھرتے ہیں شاعر اُن پر احساس کی گہری نظر ڈالتا ہے اور اپنے کامیاب مشاہدہ سے ایسے حیرت ناک نتائج پیدا کرتا ہے جن کی وجہ سے ہم شاعر کے پاکیزہ خیالات کو الہام سے قریب پاتے ہیں۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے

طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

شاعر اپنے تخیلات کے زور سے پَرِ پرواز پیدا کر کے تمام عالم کون و مکاں کی بے تکلف سیر کرتا ہے۔ ذرّہ ذرّہ اور قطرہ قطرہ کو دیکھتا ہے نگاہوں کی کسوٹی پر چڑھاتا ہے جو چیز اس کی نظر میں ٹھہر جاتی ہے اس پر اپنا مخصوص انداز بیان صرف کرتا ہے اگر عمدہ خیال کے ساتھ عمدہ زبان و الفاظ بھی ہوتے ہیں تو شعر جادو کا کام کر جاتا ہے جس کو سننے والے عالم بے خودی میں سر دُھننے لگتے ہیں۔

ہمارے بلند خیال ایشیائی شاعروں کا یہ اہم ترین موضوع ہے کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کو اپنے مشاہدے اور اپنے تخیل سے ایک ایسا نتیجہ بخشتے ہیں جو حقانیت کا بڑے سے بڑا درس ہوتا ہے۔ غزل جسے کہتے ہیں وہ اسی موضوع کی ایک صنف عزیز ہے۔ باوجودیکہ غزل کا دامن ردیف اور قافیہ کی پابندیوں سے آزاد نہیں لیکن

شاعر آزاد خیال ہوتا ہے اس کی فکر اپنی وسعت کے لیے کرید کرید کر جگہ پیدا کر لیتی ہے اور پھر اسی غزل کے محدود میدان میں لامحدود حقیقتوں کو حیرت ناک طریقہ پر سمو دیتی ہے حقیقت نگار شاعروں کا موضوع ایک ہی ہوتا ہے لیکن مختلف خیال مختلف عنوان و مختلف الفاظ سے رنگ رنگ کے پھول کھلاتے ہیں ایشیائی شاعر جب دنیا سے نیا آ رہا کی سیر کرتا ہے تو اس کے جذبات میں حقیقت نواز شگفتگی و تازگی پیدا ہو جاتی ہے اس کے خیالات کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں تحقیق و تجسس کا ذوق دل میں کرید کر پوچھتا ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں

ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

خوش نما و خوشبودار پھولوں کا ذکر نہیں وہ تو رنگ و بو کی دنیا میں جنت با صرہ و فردوس شامہ ہیں صبح اَلست کی جمال آرائیوں اور عطر خیزیوں میں بہتے ہوئے گلزار دل تک آئے ہیں آغوش نمو کی پروردہ ایک سبز پتی جسے جانور بھی پوچھے یا نہ پوچھے شاعر کی نگاہ میں بڑی عظیم المرتبت چیز ہے جس کی مدح و ثنا میں بے تکلف گل فشانیاں کرتا ہے۔

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

دل آویز و دلکش سبزہ زاروں کو چھوڑیے جو قدرت کی طرف سے ننگی زمین پر مخملی فرش بنے ہیں۔

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر ‌ ‌ ‌ ‌ روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

وہ بے ترتیب اونچی نیچی بے حقیقت ناچیز گھاس پات کہ چرندگان اگر اپنا پیٹ نہ بھر لیا کریں تو زمین خود جس نے اپنے شکم سے پیدا کیا اُسے وبال دوش سمجھنے لگے۔ ہمارا حقیقت بیں شاعر اسی ذلیل و حقیر گھاس کو دیکھتا ہے تو وحدت آگاہ پیامبر کی طرح اعلان توحید کرتا ہے۔

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
کلمۂ لا الٰہ سے گوید

برگ و گیاہ کے ظاہر و باطن پر نظر ڈالیئے اور سعدی و فیضی کے بلند خیالات کو دیکھئے کیسی بے حقیقت چیزوں سے حقیقت پیدا کی ہے۔

معرفت و حقانیت کی بہتر سے بہتر درخشندہ مثالیں غالب کے یہاں بکثرت ملیں گی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ روشن خیالی سے دیوان کا دیوان بقعہ نور بنا ہوا ہے ذرہ سے آفتاب اور قطرہ سے دریا تک کے خیالات نہایت خوش اسلوبی سے نظم ہوئے ہیں جستجو اور تلاش کی نگاہیں جب دیوان غالب کی سیر کرینگی تو بہت کامیاب ہونگی ایک ایک غزل اور ایک ایک شعر کو احتیاط کے ساتھ پڑھنا شرط ہے۔

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

غالب کے بلند خیالات کی تمام مثالوں کو نقل کرنا طوالت اور تحصیل حاصل ہے دیوان موجود ہے جس کا جی چاہے عرق ریزی و جگر خیزی کرے میں صرف چند اشعار مختصر مختصر سی تمہیدوں کے ساتھ حوالۂ قلم کرتا ہوں۔

حضرت غالب کا حقیقت پیما طائرِ خیال بقول۔

اے در رنگ و بوے تو ز آغاز
عنقائے نظر بلند پرواز

اپنی قوت پرواز کے پہلے نقطہ کو ذرّات عالم کی چھان بین میں صرف کرتا ہو
کائنات دہر کے فلسفے اور ارتقائی مسلہ پر گہر فشاں ہوتا ہے۔

ساز یک ذرّہ نہیں فیض چمن سے بیکار — سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

ہے تجلّی تری سامانِ وجود — ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

یک ذرّۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا — یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

ہے وہی بدمستیٔ ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ — جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں — ذرّہ ذرّہ روکشِ خورشید عالم تاب تھا

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — پرتو سے آفتاب کے ذرّہ میں جان ہے

اب طائرِ خیال خشکی سے پرواز کرتا ہے اور بہتے ہوئے دریا سے ایک قطرہ
پانی کا لیتا ہے اور اپنے اُمنڈتے ہوئے جذبات اور برستے ہوئے محسوسات

کو اس قطرہ آبی پر مرکوز کرتے ہوئے آبشار نغمہ سے عالم کو سیراب کرتا ہے۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔ یہ وہ حسرت ناک جذبہ ہے جس میں ازلی جام و خُم کا تازہ بتازہ نو بہ نو کیف بھرا ہے۔ اسی کیف کے عالم میں نغموں کی بہار ہے

نشۂ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب　　شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

نشۂ شاداب رنگ و ساز مست کے ساتھ بزم عیش دوست کا پتہ دیا جاتا ہے۔

غزل

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے　　نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

کس کا سُراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا　　آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جائے غبارِ شوق　　گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ　　نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گذر نہ کر　　ہر ذرہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی ‏ ‏ ‏ ‏ اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط
اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

غالب کی اس معرکۃ الآرا غزل کے صرف تین شعر یہاں پر نقل نہیں کئے گئے باقی کل ہیں جو اپنے مخصوص محاسن کے لحاظ سے اتنے کامیاب ہیں کہ انھیں مستغنی التعریف کہنا چاہیئے۔ مجھے تو اتنا ہی دیکھنا اور دکھانا ہے کہ اس پاکیزہ غزل میں از سرتا پا شراب معرفت بھری ہوئی ہے اسی شراب کے نشہ میں کہا جاتا ہے۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اور اسی شراب کے طلبگاروں سے فہمائش ہے۔

سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگام بے خودی ‏ ‏ ‏ ‏ رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیئے
یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات ‏ ‏ ‏ ‏ عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیئے

پیمانۂ صفات و مئے ذات کے میکدہ کی راہ میں حضرت خضر بھی ملتے ہیں تو ان کی رہبری قابل قبول نہیں۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

حسن اعتبار و اعتماد کہتا ہے۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

حضرت عیسیٰ کے متعلق بھی کہا جاتا ہے۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی ‏ میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

آخر کار خضر طریقت و مسیحائے اُمت کا یوں ذکر کیا جاتا ہے۔

اُن کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

دَورِ حیات

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

بعض اہلِ علم و کمال کی زندگی بغض و حسد اور کینہ و عناد کی جولاں گاہ بنی ہوئی
ہے مگر جب ان کی مادّی تصویر صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے اور یہ سکتے ہوئے
مٹ جاتی ہے کہ۔

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجئے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہئے

تو رفتہ رفتہ آنے والی دُنیا اس کے جوہروں کی قائل ہوتی جاتی ہے گو یا
مرنے کے بعد اہلِ کمال کی زندگی کا دوسرا دَور شروع ہوتا ہے جس کو حیات
بعد الممات کہنا چاہئے۔

عام طور پر دنیا میں خوش نصیب وہی لوگ کہے جاتے ہیں جو اپنی حقیقی آل و اولا
چھوڑ کر عالم فانی سے گذرتے ہیں لیکن اُن سے زیادہ خوش بخت وہ لوگ ہیں جو اپنے
عمدہ صفات و کمالات کو اولاد مجازی کی صورت میں اپنا قائم مقام کر کے دنیا
سے جاتے ہیں۔

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے بااین ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

حاتم کی اولادوں کا کہیں پتہ نہیں لیکن اُس کی سخاوت آج تک زندہ ہے
نوشیرواں کا چراغ گل ہو گیا مگر اُس کی معدلت گستری ابھی تک روشنی میں ہے
حافظ۔ سعدی۔ عرفی۔ خاقانی کی نسلیں کہاں ہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں لیکن اُن کے
کمالات دنیائے ادب کے لئے عزیز ترین نعمات ہیں۔

ماں باپ بیٹی بیٹے مرتے ہیں لوگ دو چار روز تک رو پیٹ کر بھول جاتے
ہیں اگر کبھی یاد بھی آئے تو اپنے اوصاف ہی کی بدولت۔

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

مرنے والے کی صورتیں بھول جاتی ہیں مگر سیرتیں یاد رہتی ہیں کیونکہ مادیات
فانی ہیں اور اس درجہ فانی ہیں کہ دنیا انھیں زیادہ عرصہ تک اپنے دل و دماغ کے
گوشوں میں نہیں رکھ سکتی مگر روحانی تعلقات زمانہ لامعلوم تک زندہ اور محفوظ رہتے
ہیں جن کا وجود اولاد حقیقی سے بہتر ہوتا ہے۔

ہوئی مدّت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے — وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

آج ادب اُردو کی وسیع دنیا میں غالب کی یاد تازہ ہو رہی ہے ان کے کمالات خود اُن کی زندگی کے لئے کامیاب نہ ہوئے ہوں لیکن اب اُن کی روحانی زندگی کے لئے پوری حمایت کر رہے ہیں۔

غالب کوئی مقتدر یا با اثر ہستی نہیں رکھتے تھے سو پشت سے آبائی پیشہ سپہ گری تھا

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

لیکن آج غالب کی عزّت غالب کی آبرو کا بھلا کیا پوچھنا سو پشت کے سپاہی کی دنیائے ادب میں تاج پوشی ہو رہی ہے جہاں اُردو کو اپنے اس فرمان روا پر ناز ہے اور رہیگا۔

اب ذرا غالب کی جسمانی زندگی پر بھی اک نگاہ پُر ملال ڈالئے اور دیکھئے کہ وہ کیسے کیسے شکووں سے بھری ہے۔

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

پُر ہوں یوں شکووں سے ہوں راگ سے جیسے باجا اِک ذرا چھیڑئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

ذیل کے مقطع سے دردناک زندگی کا پتہ ملتا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کون جانے کہ زندگی کن مصائب و آلام کے ساتھ گذر رہی تھی کہ جلتے بھنتے ہوئے دل سے ضبط نہ ہو سکا آخر کہہ ہی ڈالا کہ جب اسی شکل یعنی انھیں مصیبتوں سے زندگی

گذری تو ہم بھی کیا یاد کریں گے کیا جانیں گے کہ خدا رکھتے تھے۔

اسی مقصد کو ایک فارسی کے مقطع میں بھی ادا کیا جاتا ہے لیکن یہاں طبیعت کا زور اور بھی زیادہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت

میتواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

کہنے کے قابل نہیں ہے کہ غالب ناکام پر کیا گذری کہا جا سکتا ہے کہ یہ بندہ خداوند نہیں رکھتا۔

کیا دردناک حالت اُس بندہ کی ہے جس کا کوئی خداوند نہیں اس کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے جس کا کوئی پوچھنے والا نہ ہو کس غضب کی ناکامی ہے اور کس قیامت کی نامرادی ہے کہ بندہ گویا خدا ہی نہیں رکھتا۔ اب اُسے پوچھے تو کون پوچھے کون اس کی مصیبتوں کو دور کرے اور کون اُسے تسلّی و تشفی دے۔

گوش منت کش گلبانگ تسلّی نہ ہوا

دلّی سا زرخیز و مردم خیز شہر اور اس کی شکایت کوئی معمولی واقعہ یا حادثہ نہیں ہے انقلاب زمانہ کا پورا مرثیہ غالب نے ایک شعر میں کہہ ڈالا۔

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم اُلفت غالب

ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

دلی ہو یا دلّی سے بہتر دنیا کا کوئی دوسرا مقام اگر غم اُلفت کا قحط ہے تو وہ رہنے کی جگہہ نہیں اگر کوئی رہیگا تو زندگی دشوار سے دشوار تر ہوگی۔

غالب کے لئے دلّی میں عرصہ حیات کا تنگ ہونا اُن کے تمام مصائب و آلام کا

نتیجہ ہے آخر کار وطن چھوٹا اور بے وطن ہوئے لیکن گردش ایام نے ساتھ نہ چھوڑا غربت میں بھی حال بدستور رہا۔

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں

مسافرت کی تکلیفوں پر جب دل شاکی ہوتا ہے تو یاران وطن کی بے مہریاں بھی یاد آجاتی ہیں اس عذاب دوگونہ میں صبر کی تلقین یوں کی جاتی ہے۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

شکایتوں کا سلسلہ صرف یارانِ وطن ہی تک نہیں ہے ابنائے زماں کی حالت پر بھی نوحہ کیا جاتا ہے۔

کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

غالب کے ساتھ اہلِ دنیا کا جو طرز تپاک تھا وہ اس مقطع سے ظاہر ہے۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

خلق کی بیگانگی اور غالب کی اپنی آپ تسلی کس پردرد لہجہ میں ہے۔

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالب کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

انتہائے ناامیدی کی عبرتناک تصویر ان لفظوں میں کھینچی گئی ہے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

عالم یاس میں واردات قلب کا اظہار اس طرح ہوتا ہے ۔

کچھ دنوں گر زندگانی اور ہے　　ہم نے اپنے دل میں ٹھانی اور ہے

جاں کاہیوں اور مصیبتوں کے اختتام کا انتظار یوں کیا جا رہا ہے ۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام　　ایک مرگ ناگہانی اور ہے

یہ غالب کی معمولی زندگی کی روح فرسا داستانیں تھیں جو مختصر طریقہ پر بیان ہو گئیں ضمنی طور پر شاعرانہ زندگی اور اس کے اعلیٰ کمالات کی ناقدری کا گلہ بھی ٹوٹے ہوئے دل کی آوازمیں سُن لیجئے ۔ فرماتے ہیں ۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دلگی غالب
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

غالب سا نکتہ پرور دمعانی گستر اُستاد زمانہ کی کج فہمیوں کے مقابلہ میں یوں کہنے پر مجبور رہے ۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

حیات غالب کے یہ وہ حالات ہیں جو مطالعہ دیوان سے معلوم ہوتے ہیں ۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

تفصیلی حالات نہ صرف تذکرہ نویسوں نے قلمبند کئے ہیں بلکہ خود غالب نے اپنے اکثر رقعوں میں تحریر فرمائے ہیں ۔ چنانچہ ایک رقعہ میں فرماتے ہیں ۔

پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا ۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا اُس کی جاگیر کے عوض میں میرے اور میرے شرکا حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ

سال مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے نہ دے مگر تین ہزار روپیہ سال ان میں خاص میری ذات کا حصّہ ساڑھے سات سو روپیہ سال فقط۔ میں نے سرکار انگریزی میں غبن ظاہر کیا کولبرک صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ بہادر سکرٹری گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہوگئے سکرٹری گورنمنٹ بمرگِ ناگاہ مر گئے بعد ایک زمانہ کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ ان کے ولیعہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بصلۂ مدح گستری پانچ سو روپیہ سال مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی ایسے طالع مربی کُش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔"

اس مختصر سے رقعہ میں غالب نے اپنے دورِ حیات کے تمام روح فرسا حالات بیان کر دئے ہیں جن کے بعد کسی تفصیلی تذکرہ کی چنداں ضرورت نہیں اگر دل اثر قبول کرے تو اتنا ہی دیکھنا اور سمجھنا کافی ہے کہ بیشتر رقعوں میں لکھا گیا ہے۔ موت کا طالب غالب مرگِ ناگہاں کا طالب غالب۔

حیاتِ غالب کی تمام تر مصیبتوں اور جاں کاہیوں کا حقیقی صلہ جو انھیں قدرت کی طرف سے عطا ہوا وہ ان کے پاکیزہ جذبات کے اندر قیامت تک کے لئے ہے۔ ضرورت ہے کہ شاعر کے دل میں کافی درد ہو، سوز ہو، گداز ہو تا کہ اس کے کلام میں غیر معمولی اثر پیدا ہو اگر سینہ کے اندر مجروح دل نہیں ہے تو حقیقی جذبات کی پُر کیف موجیں تخیلات میں نہیں پیدا ہو سکتیں۔

غالب کی زندگی کے جو حالات تھے وہ اُن کی زندگی کے ساتھ گذر گئے، لیکن غیر فانی اثرات ان کے بلند آہنگ کلام میں ہمیشہ کے لیئے باقی رہ گئے اور انھیں اثرات کی بدولت غالب کو ایک دوسری زندگی پہلی زندگی سے زیادہ شان دار اور زیادہ کامیاب نصیب ہوئی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ غالب اپنے ہر شعر کے اندر زندہ نہیں ہیں اُن کی علمی و ادبی زندگی کا نہایت کامیاب دَور ہے یہ زندگی قدرت کا عطیہ ہے جو ہر ایک کو نہیں عطا ہوتا موت کی مجبوری اگر تھوڑی دیر کے لئے اجازت دے اور غالب قبر سے باہر آسکیں تو دنیائے ادب کا ہر ایک فرد غالب غالب کہتے ہوئے بیتابانہ ان کی طرف دوڑے گا۔ یہی ہیں ان پاکیزہ جذبات کے عمدہ نتائج اور بہترین صلے جن کی آفرینش غالب کے قلب کی جراحتوں میں ہوئی ہے۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

میکدۂ غالب

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

منجملہ دیگر اصناف شعر کے ساقی نامہ بھی ایک مستقل صنف ہے ہمارا شاعر جب اپنے خیالی میکدہ میں پہنچکر دو چار جام خالی کر دیتا ہے تو پھر نشہ کی ترنگ میں خدا جانے کس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

ہم سے کھُل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

نشہ کی حالت میں کسی کی حقیقت کو بے حجاب دیکھنے کی تمنا کیسی زبردست شوخی اور کیسا رندانہ انداز ہے چھیڑنے کی دھمکی مگر عذر مستی کے ساتھ اس ستم ظریفی میں خدا جانے کس شراب کے مزے ہیں۔

ذرا گہرے خیال سے اس شعر کا جائزہ لیا جائے تو غالب کے اندر تخیل کی پاکیزہ خصوصیت ظاہر ہو۔

غالب کے منہ سے جام لگتا ہے تو اُن کی زبان حقیقت ترجمان سے وہی باتیں ادا ہوتی ہیں جو پاکیزگی کی بہترین سے بہترین مثالیں ہوتی ہیں۔ اس دعوے کی دلیل کے لئے مے پرستی کی حقیقت ملاحظہ ہو۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

کتنا بلند اور کتنا پاکیزہ خیال ہے مے پی جاتی ہے لیکن عیش و نشاط کے لئے نہیں پی جاتی دنیا اور دنیا کے عیش و غم سے چھٹکارا دلوانے والی بے خودی کے لئے پی جاتی ہے۔

اے دل گذرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادہ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

کتنی صفائی سے کہا جا رہا ہے کہ نفس اگر زہد و تقویٰ کی منزل نہیں ہے تو دل کا وساغر کے خیال کی گذرگاہ سہی مراد یہ ہے کہ نفس کو تقویٰ یعنی پرہیزگاری نصیب نہیں ہوتی ہے تو ایک ایسی بے خودی نصیب ہو جس کے عالم میں نفس بھی کوئی قدم نہ اٹھا سکے یہ ہے غالب کی بادہ پرستی کا راز ور نہ وہ تو مے کے پینے کے مخالف بن کر کہہ گئے ہیں

تا دل میں رہ نجائے مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

کیونکہ۔

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز سوائے بادۂ گلفام و مشکبو کیا ہے

ہمارے دل میں مے کی لاگ ہے بادۂ گلفام کی طلب ہے اس واسطے ہم کو بہشت عزیز ہے اور حصول بہشت کے لئے عبادت خدا کرتے ہیں۔ یہ عبادت خالصًا لوجہ اللہ نہیں ہوئی عبادت بے لاگ اور بے طلب ہونا چاہیئے۔ کہا جاتا ہے کہ غالب صوفی تھے اور کسی صوفی بزرگ سے شراب پینے کی اجازت لی تھی۔ معاذ اللہ صوفی بزرگ

اور شراب پینے کی اجازت صوفی نہیں کسی میکدے سے نکالے ہوئے پیر مغاں کے ساتھ یہ اختراپردازی ہوتی تو شاید اس تک بندی کو شراب خانہ خراب کی بدحواسی کا شرف ملتا۔

ایسا فتویٰ جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام کر دے۔ بادشاہوں اور حکومت والوں کو تو البتہ مل سکتا ہے غالب جیسے غریب شاعر کو لاکھ برس بھی نہیں مل سکتا۔ غالباً یہ بیہودہ فتویٰ اس لئے صادر کیا گیا ہے کہ غالب کا پاکیزہ کلام اعلیٰ درجہ کے تصوف سے مالا مال ہے۔ لہذا غالب کو صوفی بنانے کی یہ انوکھی ترکیب سوجھی سلسلے کے لئے اور تو کوئی نہ ملا مگر ایک ایسا بزرگ جو حرام کو حلال کرنے والا ہو لاحول ولا قوۃ الّا باللہ۔

بیشک غالب کے اشعار تصوّف کے بہترین مقامات ہیں۔ اور غالب کی طبیعت حقیقت آشنا ہے لیکن اُن کا حُسنِ عقیدہ کہیں اور نہ تھا۔ غالب کا مرکزِ عقیدت وہاں تھا جہاں تصوف کی معراج بتائی جاتی ہے۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

کسی صوفی سے شراب پینے کی اجازت لینا ایک مضحکہ خیز بات ہے غالب تو خود ہی شاعرانہ رنگ میں عجیب و غریب فتویٰ صادر فرماتے ہیں جن سے جنبش دینے والوں کی پگڑیاں اچھل جائیں۔ فرماتے ہیں۔

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

جزاک اللہ غالب کو ساقیِ کوثر سے کس رنگ کی عقیدت ہے۔ یہ سچ کہ وہ تمام اوامر و نواہی حسنات و سیات سے بخوبی واقف تھے لیکن مطلع میں جو بات کہی ہے وہ بالکل عجیب ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جواز شراب کا فتویٰ غالب نے کف لسان کر دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے جوش عقیدت کی شرح یہ کی ہے کہ اگر شراب پینے میں اس خیال سے خست کی جائے کہ آج پیوں تو کل ساقیِ کوثر کی عنایت سے محروم رہوں گا۔ ساقیِ کوثر کے باب میں سوء ظن ہے۔

خدا جانے یہ سوئے ظن کہاں سے غالب کو ہاتھ لگا جس کو اس شعر میں صرف کر کے قیامت ڈھا دی۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب الفاظ کا استعمال جانتے تھے اور اصل شاعری اور سخن طرازی ہے۔

دوسرا مطلع ملاحظہ ہو۔

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

ایک مقام پر خست شراب کو ساقیِ کوثر کے باب میں سوء ظن قرار دے اپنے جوشِ عقیدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ دوسری جگہ پر غم گیتی سے پناہ لینے کے لئے شراب تجویز کرتے ہیں اور سزا و جزا کو بھی محسوس کرتے ہیں تو یہ غم بھی ساقیِ کوثر کی غلامی غلط کر دیتی ہے۔ اسی غلامی کا جوش و خروش اس کہنے پر مجبور کر رہا

جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

اپنا نام اور اپنے خریدار کا پتہ کس ترنگ میں بتایا جاتا ہے۔

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
نام اسد اللہ من من اسد اللہیم

بے بکنے کی شان بھی ملاحظہ ہو۔

بک جاتے ہیں ہم آپ متاع ہنر کے ساتھ
لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر
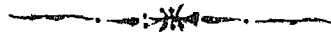
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

غالب عشق کی تعریف کرتے ہیں کہ یہ وہ آگ ہے جس پر کسی کا زور نہیں چل
معمولی آگ پر تو یہ قابو ہے کہ وہ لگائی بھی جاتی ہے اور بجھائی بھی جاتی ہے
عشق کی آگ اس غضب کی آگ ہے کہ اگر کوئی اسے لگانا چاہے تو اختیار
اور لگی ہوئی کو بجھانا چاہے تو بجھائے نہ بنے ۔

آتش بازی ہے جیسے شغل اطفال　　ہے سوز جگر بھی اسی طور کا حال
تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی　　لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

جس طرح لڑکے آتش بازی سے شغل کرتے یا کھیل کھیلتے ہیں اسی طرح آتش عشق
ساتھ جگر کھیل کھیلتا یا شغل کرتا ہے ۔

عشق کا ایجاد کرنے والا قیامت یعنی آفت کا پرکالہ تھا جو لڑکوں (قلب
کے لئے عجیب کھیل نکال گیا ہے ۔

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

اگر زمانے نے فرصت دی موقع دیا تو میں بھی دکھاؤں گا کہ عشق کا گھر ہونا

با ہوتا ہے میرے دل کا ہر ایک داغ سروِ چراغاں کا تخم ہے۔
خدا کی پناہ کس قیامت کے تماشہ کا حوصلہ ہے معلوم نہیں دل میں کتنے داغ ہیں۔

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

ہر داغ سروِ چراغاں کا تخم ہے جب تخم پھلے پھولے گا تو کتنے سرو آتشیں تیار
ں گے اور اُن سب میں کس غضب کا چراغاں ہو گا اس ترقی کی بھلا کوئی انتہا ہے
دل کے ہر داغ کو سروِ چراغاں کا تخم قرار دے کر آتشِ عشق کی مبادیات کو چار
ند لگا دیے ہیں یہ اسی حقیقت کا استعادہ ہے جو انسان کے دل میں عشق و محبت
ے پہلے نقطہ کی صورت میں ہوتی ہے فطرت انسانیہ جب عنوان محبت کو اختیار
تی ہے تو عشق کی لامتناہی داستانیں یہیں سے شروع ہوتی ہیں غالب نے اس نقطہ
سروِ چراغاں کا تخم قرار دے کر آتشِ عشق کی قیامت سوز تشریح کی ہے۔

باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

باوجود کہ ایک دنیا ہے ایک جہاں ہے مگر ہنگامہ نمائی نہیں ہے اس لئے کہ ہم
چراغاں ہیں جو قلب پروانہ کے شبستان میں ہوتا ہے۔
سوزناک محبت کی تعریف یہی ہے کہ وہ دل ہی دل میں سلگتی اور بھڑکتی ہے اور
کی دنیا کو جلتا ہوا کوہ طور بنا دیتی ہے مگر پھر بھی وہ کوئی ہنگامہ نہیں برپا کرتی۔
ہت بالکل ایسی ہی ہوتی ہے جیسے پروانہ کے قلب کو شبستان میں ہوتی ہے آگ
ہوتی ہے مگر کسی کو کیا خبر کہ قلب پروانہ میں کیا ہے دنیا تو اسی وقت اس کی حقیقت

رُخِ یار کی آب و تاب دیکھ کر میں کیوں نہ جل گیا مجھ کو جل کر خاک ہو جانا چاہئے تھا مگر ایسا نہیں ہوا اب اپنی قوتِ دیدار کو دیکھ کر جلتا ہوں۔

شعلہ سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے

دل کی افسردگی پر کس قدر جلا ہوں سوزشِ دل بھی اسقدر نہ جلا سکتی جو بات کہ شعلہ سے نہ ہوئی وہ شعلہ کی ہوسناکی سے ہوئی جلنا بہر طور ہوا پھر بھی افسردگیٔ دل کی شکایت حق بجانب رہی۔

ہوسِ شعلہ کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کتنی اور کس قدر ہے البتہ اُس کی تپش کا یہ حال ہے کہ شعلہ سے بھی بڑھ کے ہے۔

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

اہلِ شوق کے وجود و عدم کا حال کیا پوچھتے ہو وہ اپنی آگ کے آپ ہی خس و خاشاک ہو گئے۔

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

تکمیلِ شوق کی اِس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہوتی کہ انسان اُس کے لئے مر مٹے جب تک ایسا نہیں ہوتا کوئی شوق پورا نہیں ہوتا یہی تعلیم اس شعر میں ہے اپنے وجود و عدم کو ایک کر دینا اپنی آگ کے لئے آپ ہی خس و خاشاک ہو جانا بہت بڑی کامیابی ہے۔

کو سمجھے گی جب کوئی ہنگامہ آرائی ہو۔

ڈھونڈھے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

دل اس مغنیٔ آتش نفس کو ڈھونڈھ رہا ہے جس کی آواز میں جلوۂ برقِ ف[illegible]
یعنی ایسی پرسوز آواز ہو جو برق فنا بن کر جلا ڈالے جیسے لن ترانی و برق طور

وہ تپِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی چاہے

تمنا عشق کی وہ گرمی ہے کہ پھر شمع کے مانند شعلہ جگر کی نبض تک ریشہ دوانی
یعنی تمام جگر میں آگ لگا کر عشق کی روشنی پھیلانے کی آرزو۔

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
میں نہیں جلتا نفس ہر چند آتش بار ہے

ذوقِ فنا کی ناتمامی یعنی عدم کمال پر جی کیوں نہ جلے باوجود کہ نفس آتش بار
لیکن میں نہیں جلتا۔

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

دل اس لئے جل رہا ہے کہ ہم ایک ہی بار کیوں نہ جل گئے نفسِ شعلہ بار کی نا[illegible]
پر افسوس ہے۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتشکدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے اے وائے اگر معرض اظہار میں آئے

پوشیدہ راز (یعنی آتش عشق) سے میرا سینہ آتشکدہ ہے وائے اگر وہ معرض

اظہار میں آئے اس کا ظاہر ہونا اچھا نہیں کون اس کی تاب لائیگا۔

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو

نہ لائے جو کہ تاب ضبط میرا راز داں کیوں ہو

بس اتنا ہی ظاہر کر دینا کافی ہے کہ میرا سینہ راز نہاں سے آتش کدہ ہے۔

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا آتش خاموش کے مانند گویا جل گیا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار

اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

سوز نہاں سے میرا دل کھلے بند جل گیا اور ایسا چپکے سے جل گیا جیسے چپ

چپاتی ہوئی آگ۔

دل میں وصل کا ذوق اور یار کی یاد تک باقی نہیں اس گھر میں ایسی آگ لگی کہ

جو کچھ تھا جل بھن کر خاک ہو گیا۔

میں عدم سے پرے یعنی دور ہوں ورنہ میں بھی جل جاتا جب کہ میری آہ آتشیں

سے عنقا کا بال جل گیا۔

جوہر اندیشہ کی گرمی کیا عرض کیجئے اگر عرض کیجئے تو خدا جانے کیسی اور کہاں کا

آگ لگے صرف وحشت کے خیال پر تو یہ ہوا کہ صحرا میں آگ لگی اور وہ جل گیا۔

داغوں کی بہار دیکھنے کے قابل ہے مگر کیا کروں دل نہیں دکھاتا میں اس چراغاں کا کیا کروں جس کا کارفرما جل گیا۔

یک قلم کاغذ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقش پا میں ہے تپ گرمیٔ رفتار ہنوز

تمام صفحۂ دشت یک قلم کاغذ آتش زدہ یعنی جلا ہوا کاغذ ہے ایسا اس لئے ہے کہ پاؤں کے نقش میں رفتار کی ابھی تک سوزش ہے۔ کس قیامت کی آگ ہے جس نے دشت کو جلا ڈالا۔

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتش فشانی کا مذاق آزادی ہی تک محدود نہیں اسیری میں بھی یہ حال ہے کہ قید و بند نے جو تلووں میں آگ لگائی ہے وہ اتنی تیز ہے کہ زنجیر کا ہر اک حلقہ موئے آتش دیدہ ہے۔

اثر آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں صورت رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھسے
شوق دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے ہو نگہ مثل گل شمع پریشاں مجھسے

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاک گلستاں مجھسے

پاؤں میں آبلہ اور آبلہ میں یہ اثر یہ گرمی ہے کہ صحرائے جنوں کا جادہ موتی کی لڑیوں کے مانند روشن ہے۔

اگر دیدار کے شوق میں میری گردن ماری جائے یعنی میں قتل کیا جاؤں تو میری نگاہ شمع کے گل کے مانند مجھ سے علیحدہ ہو جائے۔

میری گرم نگاہ سے اک آگ ٹپکتی ہے جس سے گلستاں کا تمام خس خاشاک چراغاں ہے۔

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

زندگی میں تو عشق کا شغل آتش باری تھا ہی مرنے کے بعد بھی یہ حال ہے کہ دیوانے کی تربت زیارت گاہ طفلاں ہے لڑکے سنگ بازی کر رہے ہیں اور شعلے تربت پر پھول چڑھا رہے ہیں۔

ہے ننگ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

دل اگر آتشکدہ نہ ہو تو سینہ کے لئے ننگ ہے نفس اگر آذر فشاں نہیں تو دل کے لئے عار ہے۔

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے

مانا کہ ہمارا دل آتشِ دوزخ کا جلوہ زار ہے غضب کی آگ لگائے ہوئے ہے لیکن شورِ قیامت کا فتنہ کس کی آب و گل میں ہے کون ہے جو قیامت برپا کئے ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

ہمارے دل کو دوزخ نہ سمجھو ایسا سمجھنا غلطی ہے بھلا آتشِ دوزخ میں اتنی گرمی کہاں غم ہائے نہانی کی آگ شئے دیگر ہے۔

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

التہاب نار سے خوئے یار ملتی ہے دل سوز و جانسوز ہے اگر عذاب یعنی آگ میں جلتے ہوئے راحت نہ ملتی ہو تو کافر ہوں۔

حضرت غالب کے قلم کی یہ قیامت سوز گرمی جو سرو چراغاں کے تھم اور قلب پروانہ کے شبستان سے شروع ہوئی دنیائے عشق میں کسقدر اور کہاں کہاں پھیلی یہ صرف شاعرانہ ترقی نہیں بلکہ بڑھتے ہوئے جذباتِ عشقیہ کی اصلی تصویریں ہیں جو حقیقت کے رنگ و روغن سے مزین ہیں۔

وہی آتشکدہ جو سینہ میں پوشیدہ تھا اُسی نے نہ صرف دل اور دل کی دنیا کو جلایا بلکہ پرِ عنقا تک کو جلا ڈالا غالب نے جس عنقا کا ذکر کیا ہے اُس سے مراد عالم فانی ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں۔

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

آتشِ عشق کی بہت بڑی کامیابی یہی ہے کہ وہ دنیا کو جلا ڈالے اور قلبِ عاشق کو دنیائے زشت وزبوں کی ہوائے ناپاک سے محفوظ کر دے اگر عاشق کے دل میں یہ آگ نہیں ہے تو بیشک اُس کا دل سینہ کے لئے ننگ ہے اگر دل کو اس آگ میں راحت نہ ملے تو بلاشبہ کافر ہے۔

غالب کے تخیلات کی انتہائی گرمیوں کو دیکھیے۔

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں معشوق کی شان جلالی اور دوسرے میں کیفیات و لذاتِ عشق کو بیان کیا ہے کافر اور عذاب یہ دو الفاظ شعر میں عشق حقیقی کی تفسیرات بیان کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ وہ عاشق جو رضائے معشوق کا دلدادہ ہے اگر محبوب اُسے اپنی مرضی سے آگ میں بھی ڈال دے تو آگ اس کے لئے گلزار ہو جائیگی اور اُسے اس عذاب میں راحت ملیگی اگر راحت نہ ملے گی تو وہ عاشق نہیں دل وہی ہے جو رضائے محبوب میں فنا ہو کر دنیا کی تکلیف و راحت سے بالکل بے خبر ہو جائے جب تک ایسا نہیں ہوتا عشق اپنے کمال کو نہیں پہنچتا یہ وہ رموز عشق ہیں جنھیں بیان کرنے کے لئے بڑے بڑے دفتر کی ضرورت ہے ہاں غالب کا سا معجز بیان شاعر ہو تو البتہ دریا کو کوزے میں بھر دے بلکہ قطرہ قطرہ میں بند کردے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ

خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گل چیں ہے

جاری تھی اسدؔ داغ جگر سے مرے تحصیل
آتش کدہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

آتشِ فراق میں سلگنے اور جلنے والے جو اپنے دل کی آگ کو بھڑکا کر کہتے ہیں۔

شب کہ برق سوزِ غم سے زہرہ ابر آب تھا — شعلہ جوالہ ہر اک حلقہ گرداب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا — یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

جب آہ و فغاں پر آمادہ ہوتے ہیں تو خود بھی فرش سے عرش تک طوفان برپا کر دیتے ہیں اور آتش کدہ قلب کی سوزناکیوں کے دامن پر آنسوؤں کی چھینٹیں مارتے ہیں میں بھی غالب کی شعلہ فشانیوں کے بعد اشک ریزیوں سے اپنے چند صفحات کو پُرنم کرتا ہوں۔

دنیا اشک آدم کے خمیر سے بنائی گئی ہے اس کی نشو و نما صفی اللہ کی سرد آہوں میں ہوتی ہے جنّت کا غم رہا ہو یا بیٹے کا ماتم ترک اولیٰ کا صدمہ یا تقرّب سے علیحدگی کا رونا ابو البشر کی زندگی اک ایسے ہنگامہ کے ساتھ تھی جس کا سلسلہ اُن کے فرزندوں میں آج تک ہے اور قیامت تک رہیگا۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

ان قطرات کی قدر و منزلت کون بتا سکتا ہے اور کون سمجھ سکتا ہے جو کیفیات قلب کا جوہر بن کر آنکھوں میں آتے ہیں دنیا انھیں حقیر سمجھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا کے نزدیک یہ بڑی چیزیں ہیں جب ہی تو وہ حکم دیتا ہے کہ ہنسو کم روؤ زیادہ یہ وہ خدائی فلسفہ ہے جس کی تشریح عملی ارباب روحانیات نے ہمیشہ کی ہے۔ سالکین و صالحین کے جھونپڑوں میں کوئی دولت و ثروت نہ ملے گی مگر اُن کے مصلّوں کے اوپر آنسوؤں کے چمکتے ہوئے موتی بے شمار ملیں گے جو عاقبت میں گوہر پوش محلات بنائیں گے۔

آنسوؤں کا فلسفہ سمجھنے کے لئے صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ آنسو قلوب انسانی کو دھوکر پاک و صاف کر دیتا ہے۔ قلب کی صفائی و پاکیزگی سے بڑھ کر کوئی شے ہے نہ انسان کو چاہئے۔

روسنے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے
دھوئے گئے ہم اتنا کہ بس پاک ہوگئے

سالکین و صالحین خدا کی یاد میں روتے ہیں اور رو کر پاک و بے باک ہو جاتے ہیں بڑے بڑے ولی اللہ۔ بڑے بڑے نبی۔ رسول پیمبر اسی حقیقت پر عمل پذیر تھے اُن کی زندگی آنسوؤں میں ڈوب کر پربہار رہتی۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

فقیر۔ بادشاہ۔ حاکم۔ محکوم۔ مریض۔ تندرست۔ قیدی۔ آزاد۔ شیرخوار نوعمر۔ جوان۔ بوڑھا۔ غرض کہ کوئی بھی ہو دنیا بغیر ہر ایک کو رلائے چھوڑتی نہیں

کسی نہ کسی حیلہ سے آنکھیں نم ضرور رہتی ہیں کم یا زیادہ ۔

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

مبارک ہیں وہ ہستیاں جو حکم خدا سے ہنستی کم اور روتی زیادہ ہیں اور مسعود ہیں وہ پاک وجود جو اپنے کو عشق خدا میں آنسوؤں سے شرابور رکھتے ہیں ۔

میں جس عنوان سے قلم کو جنبش دے رہا ہوں وہ بظاہر میرے موضوعات سے الگ ہو لیکن اس مختصر سی تمہید کے اثرات میں آگے چل کر دکھاؤں گا کہ حضرت غالب کتنے زبردست حقیقت نگار تھے انھیں اس فن میں کیسی دستگاہ تھی ۔ سچی کیفیات و حقیقی جذبات کو نظم کرنے میں کس درجہ ملکہ تھا ۔ اگر بے دلی سے دیکھئے تو رونے رولانے کے مضامین ہی کیا غزلیں تو اس لئے نظم کی جاتی ہیں اور اس لئے پڑھی جاتی ہیں کہ طبیعت میں سرور پیدا ہو نہ کہ رونے کے لئے غزل کو مرثیہ سے واسطہ ہی کیا ۔ لیکن یہ خیال غلط اور بالکل غلط ہے ۔ غزل غزل ہی نہیں ۔ شعر شعر ہی نہیں اگر ساز نشاط کی نقرئی آواز بن کر پارہ کی طرح غائب ہو جائے ۔ سامعین کے تبسّم یا محفل کے قہقہوں میں ڈوب کر فنا ہو جائے ۔

غزل وہ غزل ہے ، شعر وہ شعر ہے جو سننے والے کے قلب کو برما برما کر نقش کالحجر بن جائے ۔ جگر میں تیر کی طرح دھنس جائے نشتر کی طرح ڈوب جائے سوز و گداز کا دریا بہا دے ۔ حسّیات و جذبات کی دنیا میں سیلاب عظیم برپا کر دے طبیعت کو حقیقی لذّت اور نفس کو فطری چاشنی بخشے ۔ یہی عطیات نعیم فانی ہیں جو غالب کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں ۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

مضامین اشک میں یہ ترقیاں بھی قابل دید ہیں کہ حسن انتظام سے پہلے چھوٹے چھوٹے قطرے گرتے ہیں پھر بڑی بڑی بوندیں اُس کے بعد موسلا دھار بارش ہوتی ہے اور آخر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب آسمان پھٹ کر زمین پر آ جائے گا ایک دنیا ہے جو تہ آب ہو جائے گی اور ایک عالم آبی ہے جو خوبیٔ مناظر سے بدل جائے گا۔

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل — سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

اشکِ غالبؔ

شب زلف و رُخ عرق فشاں کا غم تھا   کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا ہوں ہزار آنکھ سے صبح تلک   ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُرنم تھا

محبوب کی زلف اور اُس کے عرق فشاں رخ کا رات کو غم تھا رات کا حال کیا بیان کروں اور کیا شرح کروں کہ وہ کیسا عجیب عالم تھا۔

بجائے دو آنکھوں کے ہزار آنکھوں سے تا بہ صبح رویا گیا اس لئے کہ آنسو کا ہر قطرہ ایک دیدۂ پُرنم تھا۔

دل میں پھر گریہ نے اک جوش اُٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

حرماں بخت و ہجراں نصیب جن کے قلب و جگر خون اور خون پانی ہوکر آنکھوں سے بہنے کے لئے ہمہ وقت بے تاب ہوں اُن کے جوشِ گریہ کی داد کون دے۔ جن کے آنسوؤں میں یہ طاقت یہ روانی ہو کہ گویا دریا اُمنڈا چلا آرہا ہے اُن کے سرجوشِ فغاں کو اگر طوفان نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔

اللہ اکبر وہی ایک قطرہ خون جس کے متعلّق کہا جاتا تھا کہ۔

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

کجا ایک قطرہ خوں اور اُس کی باندازِ چکیدن سرنگونی اور کجا یہ طوفان جو گریہ سے پیدا ہوا۔ سچ ہے کہ شبِ فراق جب کہ صرف قطراتِ اشک ہی میں نمودِ زندگی ہو تو پھر کیوں نہ دل کھول کے رویا اور طوفان برپا کیا جائے۔

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

ظلم ہے ستم ہے اور قہر ہے اگر اس جوشِ گریہ میں نصیحت یا ملامت کی جائے۔

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

وہ غمگین و دل گرفتہ جس کے دل کا کوئی عقدہ نہ کھلے جس کی کوئی آرزو نہ پوری ہو اُس کے رونے پر ندیم کا ملامت کرنا جوشِ گریہ کو اور بڑھاتا ہے اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ جوشِ گریہ جو دل میں اٹھا ہے وہ کیا کرتا ہے اور وہ قطرہ جو طوفان بنکے نکلا ہے کیا رنگ لاتا ہے۔

غالب کے خیالات کی ترقی کا برابر اندازہ کرتے ہوئے چلئے مضامین متحد الخیال کو پے در پے ترقیاں دے کر نظم کرنا یہ غالب کی خصوصیات میں داخل ہے اور یہی وہ کمالِ سخن ہے جس سے غالب شعرا کی صف میں سربلند ہیں۔

خانہ خرابی

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وہی گھر جس کے متعلق کہا گیا ہے۔

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملہ اسباب پریشانی مجھے

گریہ گھر کی خرابی چاہتا ہے صورت حال یہ ہے کہ در و دیوار سے بیابان ٹپکنے کی کیفیت پیدا ہے۔

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے مرے دربان کا

لیکن گھر والے کو اس تباہی و بربادی کی پروا کیا۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

وہ دیوانۂ عشق جس کی نگاہ میں تمام دنیا ایک وسیع بیابان اور وہ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ اس بیابان میں ہم ہی ہم ہیں تو پھر اُسے گھر یا گھر کی سو گز زمین کی کیا پروا ہوسکتی ہے گھر اگر خراب ہو رہا ہے تباہ ہو رہا ہے تو بلا سے خراب و تباہ ہو۔

سامانِ گریہ

ہجوم گریہ کا سامان کب کیا سینے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

گریہ نہیں، ہجوم گریہ کا سامان کیا جاتا ہے مگر حالت یہ ہے کہ در و دیوار (بمنت) پاؤں پر گر پڑتے ہیں جب گریہ کیا جائے گا تو کیا قیامت برپا ہوگی اور کیا حشر ہوگا۔

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھیے
اس کے جوشِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

در و دیوار کا پاؤں پر گرنا بھی عجیب لطف اندوز بات ہے کسی کو نصیب خانماں خراب کرے کسی کا گھر برباد ہو بھلا کسی کے دل کو لطف کیا آئیگا ایسا ہی کوئی شقی القلب ہو تو کسی کی بربادی سے لطف اندوز ہو لیکن غالب کی اس لطیف سحر طرازی کو کیا کیا جائے کہ گھر گرتا بھی ہے اور نہیں بھی۔ سامان گریہ دیکھ کر پاؤں پر گر پڑتا کس مزے کی بات ہے اگر پاؤں پر نہ گرتا تو البتہ گھر کا گرنا افسوس ناک ہوتا مگر پھر یہ لطف شعر میں کہاں ہوتا اور فنِ شاعری کا حق کیسے ادا ہوتا۔

ہجوم گریہ کا سامان دیکھ کر گھر پاؤں پر گر پڑتا ہے خدا جانے کس زور شور کا گریہ ہے بھلا اس حالت میں گھر کی منت گذاری کا اثر کب تک۔

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ　　سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہر سنگ و خشت ہے صدف گوہر شکیب
نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

گھر کی بربادی و تباہی سے کیا رنج و افسوس ہو ہر سنگ و خشت گوہر شکیبا
صدف ہے صبر و شکیب کی دولت بھلا کسے نصیب ہوتی ہے اگر جنون سے سودا کر
پر یہ دولت ہاتھ آئے تو نقصان کیا۔

یوں بھی کہنے اور سمجھنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ دنیا کا ہر سنگ و خشت گوہر شکیب
ہے یعنی تاریخ عالم کا پریشان ورق جو انسان کو ایک سچا درس حریت دیتا ہے
بتلاتا ہے کہ دنیا فانی اور اسباب پریشانی ہے اس سے علیحدہ ہونے ہی میں
و آزادی ہے۔ جب دنیا کا یہ حال ہے تو پھر کسی ایک گھر کی آبادی کیا اور بربادی

لے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

کیسا گھر اور کیسی عافیت اور کہاں کا انتظام اب تو سیلاب گریہ در و دیوار کا
ہے عافیت و انتظام کا خیال سیلاب گریہ کے ہوتے ہوئے قابل پذیرائی نہیں
کی اس خواہش کا مقابلہ کون کرسکتا ہے کہ گھر خراب ہو۔

غرّۂ اوج بنائے عالم امکان نہ ہو — اس بلندی کے نصیبوں میں ہی پستی ایک
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے — بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک

جب عشق کی خانہ خرابی ہجوم گریہ بن کر خانہ بربادی کے لئے آمادہ ہوچکی ہے تو پھر کسی ایک گھر کا ذکر کیا۔

یوہیں گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

غالب کا جوش گریہ اگر یوہیں رہا اور وہ اسی طرح روتا رہا تو ایک دن تمام دنیا ویران ہو جائے گی۔

کون کہہ سکے کہ یہ بزم خاکی وہ حسرت کدہ نہیں جس کی تعمیر و تخریب میں آنسو ہی آنسو ہے۔

وفورِ اشک

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

اشکوں کی زیادتی نے گھر کا یہ رنگ کیا کہ دیوار کی جگہ در ہو گیا اور در کی جگہ دیوار ہو گئی۔

اس انقلاب آفرینی میں سخت بارش اور انہدام مکانات کی عبرت ناک حسرت ناک تصویر کھینچ دی گئی ہے لیکن حضرت غالب اسی حسرت ناک منظر کو انتہائے لطف کے ساتھ نظم فرماتے ہیں کلام کی بے باکی اور اس کا بیباختہ پن دادطلب ہے۔

وفورگریہ کا رنگ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ دیوار در ہے اور در دیوار ہے یہ وہ آئے دن کے مشاہدات ہیں جنھیں دیکھتے دیکھتے آنکھیں عادی ہو گئی ہیں اور یہ ایسی مخصوص باتیں بھی نہیں ہیں جو قابل بیان ہوں مگر فنِ سخن کا یہی کمال ہے کہ وہ معمولی سے معمولی بات کو بھی ایک پُر لطف داستان بنا دیتا ہے۔

لختِ جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ گل
تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

اس کثرت کے ساتھ اشک بہائے گئے کہ گھر در کا نام نشان نہ رہ گیا رہتا تو کیا رہتا وہاں تو اس زور شور کا گریہ کیا گیا کہ آنکھوں سے دریا بہہ گیا اور وہ دریا گھر کو بہائے گیا مگر اس خانہ خرابی پر کوئی اظہار ملال نہیں کیا جاتا صبر وسکون کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ اگر ہم نہ روتے جب بھی ہمارا گھر ویران ہوتا۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے ویراں کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے

گھر کیا اور اس کی بربادی کیا دنیا اور دنیا کی ہر شے فانی کسی خرابی یا کسی تباہی کا رنج کیا افسوس کیا۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ذرا گھر کی بربادی کا ثبوت بھی ملاحظہ ہو کہا جاتا ہے کہ بحر اگر بحر نہ ہوتا بیاباں ہوتا۔ امکان ہے کہ دریا اگر اپنی جگہہ پر نہ ہوتا تو صحرا ہوتا۔ آبادی کا اعتبار ہی کیا آج ہے کل نہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

خدا جانے دنیا کی کتنی بستیاں ویران ہوئیں کتنے بسے بسائے شہر کتنے ملک بیابان ہو گئے نوحؑ کے طوفان سے پہلے کیا تھا اور بعد میں کیا ہوا۔

بابل ذمینوا کی کھدائی نے بتا دیا ہے کہ طوفان نوح سے پہلے کیسی لیسی بسائی دنیا تھی تاریخ کے اوراق بتا رہے ہیں کہ آج بھی دنیا اک طوفان کا انتظار کر رہی ہے عالم فانی کا جب یہ حال ہے کہ مٹنا، برباد ہونا خود اُس کی تعمیر میں مضمر ہے تو پھر کیوں نہ کہا جائے۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کیا اچھا ہو کہ ناپائدار و ناقابل اعتبار دنیا اُن آنسوؤں میں بہہ کر فنا ہو جائے جو محبت کی آنکھوں سے جاری ہوں جب ویران ہونا یا کسی روز نہ آب ہونا ہی ہے تو کیوں نہ دنیا آنسوؤں میں غرق ہو۔

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب ہے

نہ پوچھ بے خودیٔ عیش مقدم سیلاب کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

قلّتِ گریہ

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

یہ نہ کہیے کہ گریہ دل کی حسرت کے برابر ہے حسرت ایک دریائے بے پا
ہے جس کا دنیا میں اور چھور نہیں ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

جب حسرت کا یہ عالم ہے کہ وہ طول و عرض سے آزاد نہ اس کی کوئی حد نہ
انتہا تو پھر گریہ اس کے برابر کہاں یہاں دل میں حسرت اور نگاہ میں دریا کا جمع و خرچ ہے
دیکھیے غالب کے خیالات کی رو کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے دل کی حسرت اور دریا
کا جمع خرچ یہ معمولی نکات نہیں ہیں دریائے سخن کے بے بہا موتی ہیں انھیں پرکھنے کے
لیے جوہر شناس آنکھیں چاہئیں دریا کا جمع خرچ یعنی قطرہ قطرہ کا حساب ۔

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی   جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

جب نگاہ میں دریا کے قطرہ قطرہ کا حساب کتاب ہے تو پھر کیا بتایا جا سکے کہ گریہ
کس مقدار میں بہا جا رہا ہے نہ حسرت کا اندازہ ہو سکتا نہ حسرت گریہ کا۔

ڈوبی ہوئی آسامی

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

جوش گریہ نے یہاں تک ترقی کی ہے کہ دل ڈوب گیا اور اب دل ایک ڈوبی ہوئی اسامی ہے اس لئے آرزو خرامی سے کہا جا رہا ہے کہ تو حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ۔

کتنی پیاری اور کیسی سلیس اردو ہے کس درجہ دھلی ہوئی زبان ہے۔ حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ۔ ڈوبی ہوئی آسامی۔ اردو کے خاص خاص محاورات ہیں جنھیں غالب نے اعلیٰ درجہ کے مضامین کے ساتھ نظم فرمایا ہے یہی وہ مقامات ہیں جہاں ان کی قادر الکلامی کا پتہ ملتا ہے۔

ڈوبی ہوئی اسامی ناقابل وصول رقم کو کہتے ہیں جب کوئی رقم ناقابل وصول ہو جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس رقم سے ہاتھ دھو بیٹھو دل بھی انسان کی بڑی رقم اور بڑی دولت ہے وہ جوش گریہ میں ڈوب گیا جس کے ملنے کی کوئی امید نہیں لہذا آرزو یا آرزو خرامی سے کہا جاتا ہے کہ تو حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ۔

اک مختصر سے شعر میں کتنی باتیں کہہ ڈالی گئیں اب ذرا دوسرے رنگ کی تشریح کیجئے تو شعر کی بلند حقیقت کا انکشاف ہو۔

تزکیہ نفس کا مسئلہ پیش نظر کر کے اس شعر کی قدر و قیمت جانچنا چاہیے بلا خوف
تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ بیت ہے جو تصوف کی اندھیری نگری میں چراغ جلا دے
ایک صوفی باصفا کی اس سے زیادہ اور کیا آرزو ہو گی کہ یادِ خدا میں روتے
روتے اُس کا دل ڈوب جائے یہی دل کا ڈوب جانا تو فنا فی اللہ کا درجہ رکھتا ہے
جب دل فنا فی اللہ ہو گیا تو پھر اُس کا حاصل ہونا کیا معنی حاصل ہونے کی آرزو کو
ہاتھ دھونا چاہیئے دل اب ڈوبی ہوئی اسامی ہے وہ کنشت سے نکل کر بہشت
میں جا پہنچا جہاں سے کوئی بھی واپس ہونا نہیں چاہتا۔
دل کا جوشِ گریہ میں ڈوبنا اور اُسے ڈوبی ہوئی اسامی قرار دے کر آرزو
خرامی سے کہنا کہ حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ بڑے پیارے انداز کی سحر بیانی ہے خدا جانے
غالب کے مُنہ سے الفاظ نکل کر کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔

کفِ سیلاب

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

وہاں عذرِ بارش عناں گیرِ خرام تھا یعنی محبوب کی راہ روکے ہوئے تھا یہاں فراق کی شدّت میں اس زور و شور کا گریہ ہو رہا تھا کہ پنبۂ بالش کفِ سیلاب یا کفِ سیلاب پنبۂ بالش تھا۔ اگر پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا تو سیلاب کی ہمہ گیری معلوم اور اگر کفِ سیلاب پنبۂ بالش ہو گیا تو سیلابِ اشک کتنا پائدار تھا کہ اس کے کف میں شانِ استحالت پیدا ہو گئی۔

گو یہ عظیم الشان طوفانِ گریہ ہے لیکن اس کو غالب کی دنیائے جذبات کے موسمِ باراں کی چند ابتدائی بوندیں سمجھئے۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

لطفِ بیان کے لئے ماضی کو حال سے بدل کر کہتا ہوں کہ محبوب کرم کے لئے تیار ہے لیکن عذرِ بارش گھر سے قدم نکالنے کی اجازت نہیں دیتا۔

نہیں کہا جا سکتا کہ بارش اور عذرِ بارش کیا ہے لیکن غالب کی طبیعت کا جوش و خروش اور اُن کی معنی گستری اتنا ضرور بتاتی ہے کہ یہ بارش اُسی گریہ کا نتیجہ ہے

جس نے طالب کے یہاں پنبۂ بالش کو کف سیلاب یا کف سیلاب کو پنبۂ بالش بنا دیا ہے یہ خیال اپنی جگہہ پر ایک جدت ہی سہی مگر خیال کو اک ذرا وسعت دیکر حقیقت حال معلوم کرنا چاہیئے۔

اس موقع پر طالب کو ایک بندہ صالح و سالک راہ صفا اور مطلوب کو محبوب حقیقی سمجھ کر شعر کی بلند آہنگی دیکھی جائے گی تو وہ کیف حقیقت سامنے آجائیگی جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

عذر بارش کے مناسب موقع اور صحیح معنیٰ کو صفات لغت میں نہ دیکھنا چاہیئے بلکہ حقیقت حال کی روشنی میں تلاش کرنا چاہیئے اگر بارش اور عذر بارش کے لغوی معنی صرف سکئے جائینگے تو شعر کی روح فریاد کرے گی۔

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر   اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبوئے

یہاں تو حالت یہ ہے کہ۔

آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ ہے

عامیانہ خیال کو ٹھنڈے دل سے خیرباد کہہ کر حقیقت کا پردہ اٹھانا اور دیکھنا چاہیئے یہاں نہ بازاری تخیلات ہیں نہ بازاری عاشق نہ بازاری معشوق جسے برسات کی جمی ہوئی کائی سے اتنا خوف ہو کہ اگر پاؤں پھسلا تو کوٹھے کے نیچے ٹھکانا نہ ہوگا میں کہتا ہوں اور زور سے کہتا ہوں کہ جن کے خیالات میں سوقیانہ مذاق ہو نام نہاد عشق و محبت کی پریشان کن کیفیت ہو خدا کے لئے وہ غالب کے دیوان کو ہاتھ نہ لگائیں۔

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

بارش کیا ہے اور عذر بارش کسے کہنا چاہیئے سُنئے بارش کہتے ہیں عاشق صادق کی اشک افشانی کو اور عذر بارش اسی اشک افشانی کی قلت کو جو کرم کے لیے عناں گیر خرام ہو گی۔ گو اہل طلب کے یہاں طوفان عظیم برپا تھا لیکن وہ طوفان نہ محبوب کے پورے لطف و کرم کا مستحق نہ خود عاشق کے نزدیک قابلِ استغنا تھا لہذا جوش گریہ کو اور بھی پُر بہار ہونے کی ضرورت لاحق ہوئی۔

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے / یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا
ہیں بسکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے / ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز / ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

حقائق نگاری کے ساتھ شانِ سخن طرازی اپنے دلکش انداز میں لہریں لے رہی ہے موتی کی طرح شعر میں دل پروئے جاتے ہیں یہی وہ اندازِ بیان ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتا غالب کے لذت بخش اندازِ شیریں کلام نکات خدا جانے کہاں تک غیر فانی ہیں اگر صفحاتِ قرطاس کی مدتِ حیات ختم ہو جائے گی تو یہ دلوں میں باقی رہیں گے اگر کاغذ کی طرح قلوب بھی مادی ہیں اور فنا ہو جانے والے ہیں تو غالب کے جواہر پارے دل کی تابندگیوں کو روحیں اپنے دامنوں میں سمیٹے رہیں گی۔

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

ذرا حقیقت بیں نگاہوں سے اس شعر کی ندرت کو دیکھئے۔ موتی پرونے کا خیال اور محبوب خود آرا تارِ نگہ کی نایابی اور عاشق کیسی لطیف حسرت ہے سنئے کہ وہ موتی کیسے اور کیا ہیں جنھیں محبوب خود آرا یا محبوب کی خود آرائی منسلک کرنا چاہتی ہے یہ وہی منجمد قطراتِ اشک ہیں جو شبِ فراق عاشقِ ہجراں نصیب کی آنکھوں سے دم
[illegible]

کی گردن سے ٹپکتے ہیں۔ یہ ہیں دربارِ حسن کے عطیات جو ایک دن عاشقوں کو تحفۃً دئے جائیں گے۔

أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا

عاشق بھی وہ جو ہزار مرتبہ قتل ہونے کے بعد زندہ جاوید۔

قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْیَاءٌ

یہ وہ لوگ ہیں جن کے قدم جادۂ محبت سے کبھی نہیں ڈگتے۔

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں جائے   آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

دنیا لاکھ ان کو اپنی جگہ سے ہلائے مگر یہ پہاڑوں کی طرح جم جانے والے کبھی جنبش بھی نہیں کرتے تکمیل محبت کے لئے ہر ساعت ہر لحظہ مکمل طریقے سے تیار آمادہ مستعد کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے روحِ قربانی کی تصویر بنے ہوئے کھڑے رہتے ہیں۔

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے

اپنے ارادہ کی تکمیل پر جب اڑ جاتے ہیں تو کامیابی کا فلسفہ یوں بیان کرتے ہیں۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

کون ہے جو ان کو اپنے ارادہ سے روک سکے اپنی دھن سے باز رکھ سکے ان کے لئے قید و بند کی سختیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں ہتکڑیاں اور بیڑیاں پہن کر بھی آزادی کی شان دکھاتے ہیں۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی　　یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں　　ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ذوق شہادت کی نشاط انگیز رفتار میں بے قراری و بیتابی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ قاتل کی راہ میں پاؤں سے آگے سر چلتا ہے -

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

نشاط قتل کی چمن آرائی بھی لائق دید ہوتی ہے -

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے　　پر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

یہی وہ مقتولین راہ صفا و مذبوحین تیغ وفا ہیں جو میدان امتحان میں چمکتی ہوئی تلواروں کو دیکھ کر کہتے ہیں -

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ　　عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

یہی وہ لذت کشان خنجر تسلیم و رضا ہیں جو آب تیغ سے مسرور ہو کر اظہار کیفیت کے لئے یوں رطب لسان ہوتے ہیں -

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائے کہ ہاں اور

اور یہی نہیں کہ ان کی لذتوں کا سلسلہ خونی میدانوں کی فتح روحانی تک ختم ہو جائے -

گلیوں میں مری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں　　جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

کہ اب مرے محبت والوں کو داد دے سکے مگر وہی مطلوب اور وہی محبوب ہے

محبت سے آنسوؤں کے موتی کو رشتۂ وفا سے محبوبیت میں پرو کر عاشقوں کے ہاتھوں میں امتیاز عشق کے لئے پہنائیگا۔

میں ان چلتے ہوئے اشارات کو تفصیل کے ساتھ عرض کرتا مگر اوّل تو خوف طوالت ہے دوسرے یہ خطرہ بھی ہے کہ مجھ پر حد سے گذر جانے کا الزام نہ عاید ہو۔ لہذا اس تمہیدی مضمون کو یا ان ضمنی فقرات کو یہیں ختم کرتا ہوں اور پھر اُسی تخیل کی طرف آتا ہوں کہ خود آرائی کو موتی پرونے کا خیال اور تار نظر نایاب یہ اُس ہجوم اشک اور ناقابل استغنا طوفان گریہ کا حال ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

ہجوم گریہ ہے اور ایسا ہے کہ تار نگہ نایاب ہو مگر قطرات اشک ابھی استنے کامیاب نہیں ہیں کہ سلک احمر کے سُرخ دانے بن سکیں لہذا غالب اس کی تیاری کر رہے ہیں۔

جلوۂ گُل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

تناسب صوری و معنوی کے دو دریا ہیں جو اس شعر میں نہایت خوبصورتی و دل آویزی کے ساتھ موجزن ہیں حُسن کیفیات کا یہ عالم ہے کہ ایک ایک لفظ ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ شاہدان ادب کے لئے بوسہ گاہ عقیدت بننے کا زور رکھتا ہے۔

جلوہ گل و چراغان آبجو یعنی صبح بہشت و دریائے نور کون ہے جو اس نظارہ کی تاب لائے۔

یہی وہ کیفیات سخن ہیں جن کے سامنے سے سحر سامری کی تمام حقیقتیں مٹ جاتی ہیں۔ اب ذرا معانی و مطالب پر ایک گہری نظر ڈالئے اور حُسن کیفیات کے دوہرے منظروں کو مقابلہ میں دیکھئے ایک طرف جلوہ گل نے رنگا رنگ دریائے نور بہا دیا ہے دوسری طرف آنکھوں سے خون رواں ہوا کیسی برابر کی ہمرنگ کیفیات ہیں۔ ہے کوئی دل والا جو ان رنگینیوں میں ڈوب کر جام لالہ فام حاصل کرے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہوگئیں

آنکھوں سے بہنے والی زنگار رنگ جوئے خون کی آب و تاب کا بھلا کیا کہنا نورانیت عشق کی سیال کیفیت خون میں ڈوب کر جوئے خون بنی ہے شام فراق کی تاریکیوں میں روشنی کی دو بہتی ہوئی دھاریں ہیں جو آنکھوں سے جاری ہیں۔ یہ بھی دیکھتے چلیے کہ تخیلات میں پے درپے کیسی ترقیاں اور بلندیاں ہوتی جارہی ہیں ذوقِ گریہ نے کہاں تک قدم آگے بڑھائے ہیں وہی قطرہ جو طوفان بن کے نکلا اُس نے کس کس رنگ میں سیل نمائی کی اُسی نے شامِ فراق کی آنکھوں سے جوئے خون بہا کر دو شمعیں روشن کردی ہیں۔

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

ساحل

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب   اس رہ گذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

وہ دل جو عشق و محبت کی سختیاں جھیل چکا - خنجر فراق سے ذبح ہو کر خون کا دریا بہا چکا - اب وہ جگر تک دریائے خون کا ساحل بنا ہے -

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

اسی دریائے خوں کا منظر یاد ماضی بن کر بتا رہا ہے کہ جلوۂ گل یہاں پہلے گرد تھا - اُس رہ گذر کا بھلا کیا کہنا جہاں جلوۂ گل گرد ہو مگر عشق کی ترقی کب نچلی بیٹھتی ہے جلوۂ گل کو دریائے خوں بنا دیا -

ناظرین مجھے معاف کریں شعر کی تشریح شعر سے ہو رہی ہے لہذا جلوۂ گل کی نیرنگیوں کے لیے اس شعر کو دوبارہ نقل کرتا ہوں -

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

اب تو معلوم ہو گیا کہ جلوۂ گل جس نے دریائے نور بہا دیا تھا اُسی نے دنیائے دل کی گذرگاہ میں خون کا دریا بہا دیا ہے جس کا ساحل بھی معلوم اور اگر ساحل عالم سے دور تک نگاہ جا سکے تو اس جلوۂ گل کو ایک بار اور بھی دیکھیے - شعر

بسکہ ہم ہیں اِک نگاہ ناز کے مارے ہوئے   جلوۂ گل کے سوا خاک اپنے مدفن میں نہیں

لختِ جگر

تب نازِ گراں مائگیٔ اشک بجا ہے — جب لختِ جگر دیدۂ خوں بار میں آئے

عاشق تنوں کے خونیں جذبات کسی حد یا کسی منزل پر جا کے ختم بھی ہوتے ہیں یا نہیں کوئی صورت نظر نہیں آتی

ترغیبِ عشق کا یہ فطری شیوہ ہے کہ وہ آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے اور ایسی ناقابلِ اظہار لذّت بخشی جاتی ہے جس سے عاشق کی روحانی کیفیت لمحہ بہ لمحہ زیادہ ہوتی ہے وہ تمام ظاہری کیفیتیں جو دنیا والوں کا دل ہلا دیتی ہیں اربابِ عشق و محبت کے لئے لذّتِ حیات ہیں۔

کسی غمگین و مہجور کے نالوں کی تاب کون لا سکتا ہے کس کے دل میں قوّت ہے جو ان کی آہوں کو برداشت کرے مگر اُس دل کی قوت کو مرحبا کہیئے جو نالہ و فریاد ہی نہیں کرتا بلکہ آنکھوں سے خون کا دریا تک بہانے میں بیباک ہوتا ہے جب یہ حوصلہ بھی پورا ہو جاتا ہے تو دیدۂ خوں بار میں لختِ جگر کا تقاضا ہوتا ہے۔

آنسوؤں کی گرانمائیگی جو طوفان برپا کر دیتی ہے جو خون کے روشن دھارے آنکھوں سے بہاتی ہے بیک وقت ناقابلِ نازفرمائی ہے اور کہا جاتا ہے کہ جبتک دیدہ خوں بار میں لختِ جگر نہ آئے آنسوؤں کی اہمیّت قابلِ تسلیم نہیں۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

آخر کار نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ۔

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل — تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

خونِ جگر

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے ابھی مجھ کو کہ یاں کام بہت ہے

حوصلہ ہے کہ جگر خوں ہو کے آنکھوں سے ٹپکے مدعیِ عشق کے سینہ میں جگر کا وجود کھٹک رہا ہے چاہتا ہے کہ خون ہو کے آنکھ سے بہہ جائے تاکہ اُس کی جگہہ پر لازوال سوز و گداز عشق کی لذّتیں ہمیشہ کے لئے مستقل ہو جائیں لہذا موت سے کہا جا رہا ہے کہ مجھ کو ابھی زندہ رہنے دے کام بہت ہیں۔

کام کی بشارت بھی قابل توجہ ہے۔ بظاہر تو اتنا ہی کہا گیا ہے کہ جگر خون ہو کے آنکھ سے نہیں ٹپکا۔ مگر اس کے علاوہ کچھ کام اور بھی ہیں جن کے متعلق کوئی تشریح نہیں کی گئی۔ بھلا زندگی کے کاموں کی تشریح کیا، زندگی اور وہ بھی کسی ہجراں نصیب کی۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

کوئی بھی زندگی کے کاموں کی تعداد و شمار یا وضاحت کا حوصلہ نہیں کر سکتا بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ اگر زندگی ہے تو کام بہت ہیں اب اگر اُن کاموں کا پتہ لگانا ہے جن کا ذکر غالب نے کیا ہے یا جن کے پورا ہونے کے لئے موت سے التجائے زندگی کی گئی تو اُن کے خیالات کی چھان بین کیجئے۔

خونچکاں فہرست

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

تعمیراتِ عشق کی وہ خونچکاں فہرست جس کے لئے ایک سچا عاشق زندگی کی آرزو کرسکتا ہے تاکہ وہ قربان گاہ وفا پر اُن تمام قربانیوں کو ایک ایک کرکے پورا کرے جن کے بغیر کامیابی نہیں ہوتی۔

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا احساب
خونِ جگر ودیعت مژگانِ یار تھا

وہ عاشق نہیں ہے جو بڑی سے بڑی قربانیوں کی خواہش نہ رکھتا ہو یا بغیر تمام قربانیوں کی ادائیگی کے موت کو قبول کرے۔

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

عشق و محبت کی صبر آزمائیوں سے گھبرا کے خنجر پہ گلا رکھ دینا دنیائے عشق میں تسلیم و رضا کی شان سے بہت دور ہے۔

دھکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

آیئے عاشقوں کے قلب و جگر کے ایسے مختلف ٹکڑوں کو چن کر جمع کریں جن سے فرمانِ عشق کا ایک خونی محضر تیار ہو اور وہی محضر کارہائے عشق کی فہرست قرار پائے۔

جگر پارے

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے　　رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے
فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں　　درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب　　حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

بے خون دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار　　یہ میکدہ خراب ہے مے کے سُراغ کا

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ لیکن ناچار　　پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے مجھ کو

دائم الحبس اس میں لاکھوں آرزوئیں ہیں اسدؔ　　جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ　　وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ　　دیکھ خوں نابہ فشانی میری

ودیعت خانۂ بیداد کاوش ہائے مژگاں ہوں　　نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے　　تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

جب گرتشنۂ آزار تسلّی نہ ہوا　　جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے　　ہر چند پشت گرمیِ تابِ تواں نہیں
جانِ مطرب ترانۂ ہل من مزید ہے　　لبِ پردہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں

رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو　　خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں
سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے　　لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں
حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے　　جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام　　دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں　　نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

نومیدامن کی تعریف - خوں نابہ فشانی کے مزے - میکدے کی خرابی - دل کو خون کرنے کی وجہ - دائم الحبس آرزوئیں - شکوۂ آزار خلش غمزہ - ودیعت خانۂ بیداد مشقِ ناز و خونِ دو عالم - تشنۂ آزار کی ناکامی - قہر و عتاب اور ترانۂ ہل من مزید - رنج نومیدیِ جاوید حسرت آزار - دل کا خون - عشق کی مصیبت تسلیم کی خو - بے نیازی کی عادت - شوق کی چھیڑ ناکامی کی حسرت - یہ وہ جگر پارے ہیں جن کی خون آلود کیفیتوں میں ترغیب عشق حسرت سنج ہے - رہنے دے ابھی مجھ کو کہ یاں کام بہت ہے -

رشکِ غالبؔ

عشق میں بیداد رشکِ غیر نے مارا مجھے — کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست
غیر یوں کرتا ہے پرسش میری اس کے ہجر میں — بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی بیمار دوست
تاکہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک — مجھ کو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست
جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعفِ دماغ — سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر یارِ دوست
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر — ہنس کے کرتا ہے بیان شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے
یا بیاں کیجے سپاس لذتِ آزارِ دوست

خدائے سخن حضرت غالب کی اس غزل کے یہ چند مسلسل اور قطعہ بند اشعار ہیں جس کا مطلع یہ ہے۔

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست — دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

بڑی پیاری غزل ہے مقطع میں خود ہی فرماتے ہیں۔

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ — ہے ردیف شعر میں غالب ز بس تکرار دوست

قطعہ بند اشعار نہایت انوکھے اور دلکش عنوان سے لکھے گئے ہیں جن میں رشک کی بے نظیر تصویریں ہیں ہر تصویر کیف سخن کے شوخ اور دیدہ زیب رنگوں میں ڈوبی ہوئی سحر کاریوں کو داد دے رہی ہے۔

ہجراں نصیب بیمار عشق کہہ رہا ہے کہ مجھے عشق میں غیر کے رشک کی بیداد نے مارا۔ میں اپنے دوست کا بیمار تھا خوش نصیبی ہوتی اگر دوست کا دردِ ہجر میری جان لیتا مگر افسوس ہے کہ کشتہ دشمن ہو رہا ہوں۔

غیر پرسش یا عیادت کو آیا ہے استفسار حال کر رہا ہے اور اس انداز سے حال پوچھ رہا ہے جیسے کوئی دوست کا بے تکلّف دوست ہو۔

حال پوچھنے والا بیمار کی نازک طبیعت اور طریق مزاج پرسی کا لحاظ کر کے حال پوچھ رہا ہے لیکن عشق کی بدگمانی اور بے اعتباری اس کے استفسار و انداز استفسار سے بیمار عشق کے دل میں دوسرا ہی جذبہ پیدا کر رہی ہے یہ بھی فطرت کی خلش ہے کہ جب اغیار کسی وقت مزاج کرتے ہیں تو دل میں کھٹک پیدا ہوتی ہے یہاں صرف کھٹک ہی نہیں بلکہ رشک بھی ہے اور اچھا خاصا رشک ہے

بیمار کے لئے عیادت باعث تسکین قلب و پیام صحت ہوتی ہے ورنہ صرف کسی کے آجانے اور حال احوال پوچھنے سے نیز دل خوش کن باتوں سے کچھ دیر کے لئے بیمار کا دل ہی بہل جاتا ہے۔ عام علالتوں اور بیماریوں میں دوست دشمن سب ہی آجاتے ہیں۔ دُنیا کا دستور یہی ہے اس انسانی رسم و رواج سے کسی بیمار کے دل میں بدگمانی پیدا ہونے کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ عیادت سے بیمار کے دل کو خوش ہونا چاہیئے دل کی خوشی بہت بڑی صحت ہے۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہ سب کچھ سہی لیکن بیمار محبت کے لئے یہ کہاں ممکن کہ غیر عیادت کو آئے اور

اُس کا دل بدگمان نہ ہو اور پھر یہ ستم ظریفی کہ بے تکلف دوست بن کر گویا خود بھی بیمار دوست ہے نیز اس قسم کی بے تکلفانہ باتیں جن کا تعلق محبوب سے ہو ایک سچّے عاشق اور بیمار دوست کے لئے درماں کے بجائے درد ہیں۔

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

رشک غیر کی وہ بیداد جس سے بیمار دوست کشتۂ دشمن ہو جائے دنیائے جذبات میں کتنی انقلاب خیز ہے۔ اشعار پڑھیئے اور اندازہ لگایئے کہ رشک و رقابت نے کس وقت اور کس طرح وجود اختیار کیا ہے۔

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پُرافشاں نکلا

غیر بے تکلف دوست بن کر بیمارِ الفت کا حال دریافت کر رہا ہے اور تسکین و تسلّی کے لئے دیدارِ دوست کا پیام دیتا ہے لیکن بیمار کو خیال ہوتا ہے کہ یہ محبوب تک اپنی رسائی ظاہر کر رہا ہے اس خیال کے ساتھ کس قیامت کا رشک ہے رقابت کی آگ جس قدر بھی شعلہ در ہو کم ہے لیکن ایسی حالت میں کہ غیر ہی سہی مگر عیادت کو آیا ہے اُس سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا بجز اس کے کہ ضعف دماغ کا شکوہ کر کے اُس کی زبان بند کر دی جائے لیکن جب ایسا کیا جاتا ہے تو وہ ایک ہمدرد دوست کی طرح ضعف دماغ کا بہترین و زود اثر علاج تجویز کرتا ہے یعنی دوست کی زلف عنبریں کا تذکرہ شروع کر دیتا ہے یہ وہ علاج ہوتا ہے کہ دوبارہ ضعف دماغ کی شکایت غیر ممکن ہو جاتی ہے۔

اگر ضعف دماغ کی شکایت کی جاتی ہے تو گویا زلف دوست کی تاثیرات مسیحائی سے انکار کرنا ہوتا ہے اور یہ بیمار دوست کے لئے کسی طرح زیبا نہیں مشکل تو یہ ہے کہ ضعف دماغ کا علاج غیر کا تجویز کردہ ہے اس جہت سے مفید نہیں نہ اس کے فائدہ سے منکر ہونے کی قوت ہے کیوں کہ غیر کے سامنے احترام حسن بہت زیادہ ضروری ہے ۔

یہ سچ ہے کہ زلفِ عنبر یار دوست کی حدیثیں سننے کے بعد ضعف دماغ کی شکایت دنیائے عشق میں کفران نعمت ثابت ہوگی لیکن قیامت یہ ہے کہ زلف دوست کا ذکر اور غیر کی زبان ، سننے والا بیمار دوست جس کی رگ و پے میں بجائے خون محبت کی شعلہ پیکر بجلیاں بھری ہیں ۔ عشق و محبت کی بدگمانیاں دل کی گہرائیوں میں ڈوبی ہیں ۔ رقابت کے دھوئیں دماغ میں گونجے ہیں رشک کے تیز شعلے قلب و جگر میں لہرارہے ہیں اور ان تمام حالات کی موجودگی میں انسانی تہذیب و تمدن خاموش رہنے کی تاکید کر رہے ہیں مگر خاموشی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اندر ہی اندر تمام کائنات دل صف ماتم بن جاتی ہے رشک و رقابت کے شعلے پانی ہوکر آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں ۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غیر جب اس حال پُر ملال کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں انسانی جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ گریہ عاشق کو روکنا چاہتا ہے اس لئے دوست کی شوخیٔ گفتار کو بیان کرتا ہے ۔

غیر سمجھتا ہے کہ بیمار دوست جو چپکے چپکے رو رہا ہے شوخیٔ گفتار دوست کو سن کر خاموش ہو جائے گا اُس کا دل بہلے گا لیکن یہ ایک خیال خام اور کوشش ناتمام ہے گفتار دوست کی شوخیوں کا بیان لب فغاں پر تبسم پیدا کرسکتا ہے بیشک اس میں اتنی قدرت ہے کہ رونے والوں کو ہنسا دے لیکن غیر کی زبان سے نہیں۔

گریۂ عاشق کو روکنے کے لئے غیر کی یہ ترکیب مفید نہیں ہوسکتی بلکہ اور بھی باعث گریہ ہوگی کیوں کہ غیر کی ہر وہ بات جو محبوب سے متعلق ہو بیمار دوست کے لئے بجائے فائدہ مند ہونے کے تیر و نشتر بن کے قلب رشک زدہ میں درآئیگی یہ ہوسکتا ہے کہ دوست کی شوخیٔ گفتا یا اُس کے خیال سے گریہ رُک جائے لیکن یہ کہاں ممکن ہے کہ غیر جس کی ذات سے رشک و رقابت وابستہ ہے شوخیٔ گفتار دوست کا بیان کرکے گریۂ عاشق روک سکے رشک تو وہ آگ ہے کہ غیر اگر اس پر پانی ڈالے تو پانی تیل ہو جائیگا اور آتش رشک پہلے سے بھی زیادہ بھڑک اُٹھے گی۔

غیر بیمار دوست کی عیادت کر رہا ہے اور عیادت کے فرائض انجام دے رہا ہے مگر اس کی رشک آمیز باتیں ستم آور مہربانیاں بیمار دوست کو عجیب کشمکش میں ڈال رہی ہیں اب وہ حیران ہے کہ مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کرے یا لذّت آزار دوست کی سپاس گزاری دشمن اگر مہربان ہے تو اس کی شکایت کیا لیکن غیور دل اُس کو گوارا نہیں کرتا کہ دشمن مہربانی کرے لہذا اس کشمکش کی حالت میں دل کو عجیب تکلیف ہے اور اس تکلیف کے ساتھ ساتھ آزار دوست کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ اگر دوست کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے تو اسی سلسلہ میں مہربانی ہائے دشمن بھی آجاتی ہے جو ایک سچے عاشق کے لئے

سخت رشک کا باعث ہے۔

نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

رشکِ آرزو

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

یہ جانتے ہوئے کہ دوست کی ہمدمی یا دوست تک رسائی آسان نہیں ہے مشکل اور سخت دشوار ہے دشمن کسی طرح اس عزّت کو نہیں حاصل کر سکتا۔

فرصت کاروبارِ عشق کسے
ذوقِ نظّارۂ جمال کہاں

مگر پھر بھی رشک ہے کہ دشمن کے دل میں دوست کی آرزو ہے۔ دوست کی آرزو دوست کے دل میں ہونا چاہیئے۔ اگر دوست دشمن دونوں کے دلوں میں ہے تو دونوں دلوں میں اتحادِ عمل کی ایک جھلک پائی جائے گی جس کا نتیجہ رشک و رقابت ہے۔

عاشق کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے محبوب سے کوئی دوسرا بھی ظاہری یا باطنی سلسلہ رکھے گو اس بات کا ہزار دل طرح اطمینان ہو کہ غیر آشنا اثر

کسی طور سے نہیں پیدا کر سکتا کہ جس سے وہ دوست کا ہمدم ہو سکے۔ تاہم اگر وہ دل میں دوست کی آرزو رکھتا ہے تو قلب عاشق میں وہ آرزو کانٹے کی طرح کھٹکے گی۔

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

بیت زیر بحث میں جس نازک و لطیف کیفیت کو نظم کیا گیا ہے وہ جذبات محبت کے لئے آئینہ ہے یہی وہ بلند ترین مقامات عشق ہیں جہاں یا تو کسی عاشق کا دل پہنچ سکتا ہے یا غالب کے عرش پیما تخیلات و لا متناہی احساسات۔

اگر سچ پوچھئے تو جذبات و احساسات ہی شاعری کی مضبوط و مستحکم بنیادیں ہیں جن پر شعرا اپنے خیالات کے بڑے بڑے محل اٹھاتے ہیں اگر بنیاد ذرا بھی کھوکھلی ہوتی تو شاعری کی بلند سے بلند عمارت بھی ہوا کے ایک جھونکے میں خاک کا ڈھیر ہو جائے گی۔

بالخصوص غزلوں میں اگر جذبات کی موشگافیاں نہ کی گئیں تو کبھی شاعرانہ کیفیت نہ پیدا ہوگی اور جب یہ خصوصیت نہ ہوگی تو شعر مٹی کے ڈھیر سے بھی بد تر ہوگا۔

غالب کی شاعرانہ خصوصیات کا اگر جائزہ لینا ہے تو غور سے دیکھنا چاہئے کہ ان کے دیوان میں جذبات و احساسات کی دنیا کس طرح بھری ہوئی ہے۔

غیر کے دل میں دوست کی آرزو اور صرف ایک آرزو کا پیدا ہو جانا بظاہر کوئی اہم بات نہیں ہے کیونکہ جمال محبوب کی بے پناہ کشش کا تقاضا ہی ہے

کہ دنیا کا ذرّہ ذرّہ ہمہ تن دل پُر آرزو ہو کر اُس کی طرف کھنچ جائے۔

دہر جز جلوۂ یکتائے معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ایسی حالت میں اگر غیر کے دل نے دوست کی آرزو پیدا کی تو کونسی بڑی قباحت ہوئی لیکن عاشق کی دنیائے رشک میں قباحت کیا بڑی سے بڑی قیامت ہے جسے محسوس کرنے کے لئے دل درکار ہے۔

صداقت عشق و پاکیزگی محبّت اپنی راہ میں ایک تنکے کا وجود بھی گوارا نہیں کرتی نہ کہ دشمن کے دل میں دوست کی آرزو۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

گو آرزو دل ہی تک محدود رہے اُس کے اثر سے محبوب کا دامن چھو بھی نہ جائے لیکن پھر بھی چونکہ دوست کی طرف منسوب ہے یا دوست کے لئے پیدا ہوتی ہے اس لئے دنیائے عشق میں وہ ایک انقلاب انگیز تحریک ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

تھوڑی دیر کے لئے عشق و محبّت کی دنیا کو قطع نظر کیجئے وہاں تو رشک و رقابت مخصوص چیزیں ہیں ذرا عام حالات میں دیکھئے دشمن یا غیر کی آرزو اپنے مقابلہ میں کیا رنگ لاتی ہے اور کیسے کیسے کانٹے پیدا کرتی ہے صدہا موقع ایسے ملیں گے جہاں دنیا کی دنیا دست و گریباں نظر آئیگی مگر ان عام اثرات کو

طرّہ سخن بنا دینا کچھ اسی کا کام ہے جو کہتا ہے۔

حسرت سے نے لا رکھا تری بزم خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

کس حسرت کے ساتھ کہا جا رہا ہے۔

نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

اے خدا کاش کہ دشمن کو دوست کی آرزو نہ دی ہوتی کیوں کہ اس کی آرزو سے رشک پیدا ہو رہا ہے۔ رقابت کا ایک نشتر دل میں چبھا جا رہا ہے عالم محسوسات میں اک بے چینی پھیلی ہے۔

رشک اور اس کے تیز اثرات یہ وہ محرکات جذبات ہیں جو نہ صرف انسان ہی کے لیے ہیں بلکہ تمام طبقات ذی روح میں جاری و ساری ہیں۔ خیالات کی وسعت میں اگر دیکھا جائے گا تو انسان کیا ملائکہ کے دامن بھی بچتے ہوئے نظر نہ نہ آئیں گے یاد ہے وہ موقع جب کہ خاک کے پتلے پر فرشتوں کی للچائی ہوئی نگاہیں پڑ رہی تھیں۔

دنیا کب رشک کی ہمہ گیری سے بچ سکتی ہے انسان کب اس کی گرفت سے باہر ہو سکتا ہے۔

صاف دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں

ہاں اگر کوئی مقام مستثنیٰ ہے تو وہ بزم لاہوتی اگر کوئی ذات بری ہے تو وہی ذات اقدس ہے جو تمام عالم کو اپنے محبوب کا شیدائی بنانا چاہتی ہے اور

ہم سے اس کے عشق و مودت قلبی کا پُرزور مطالبہ کرتی ہے۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی

ترجمہ۔ کہو (اے رسول اپنی اُمّت سے) کہ ہم اجر رسالت کچھ نہیں چاہتے مگر یہ کہ ہمارے قرابت داروں سے محبّت کرو۔

جب رشک کا یہ عالم ہو کہ بجز ذات خدا کسی کو بھی اپنے سے خالی نہ رکھے تو پھر کسی عاشق کے متعلق کیا کہا جائے جس کا خمیر ہی رشک و رقابت کے پانی سے اُٹھایا گیا ہو کیوں کر برداشت کر سکتا ہے کہ دشمن کے دل میں اُس کے دوست یا بالفاظ دیگر محبوب کی آرزو پیدا ہو۔

رشکِ سخن

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بدآموزیِ عدو کیا ہے

بیت حاضر و بیت ماقبل دونوں قریب قریب خیالات کی ایک ہی سطح پر ہیں یا ایک ہی دریائے ذخّار کی دو مختلف النّوع موجیں ہیں۔

ایک مقام پر دشمن کی عدم ہمدمی سے اطمینان ہے دوسری جگہ پر عدو کی بد آموزی کا کوئی خوف نہیں ایک موقع پر دشمن کی آرزو سے رشک و رقابت دوسرے محل پر عدو کے ہم سخن ہونے کا اندیشہ۔

رشک و رقابت کا عالم اس شعر میں شعر اوّل سے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے محبوب سے غیر کا ہم سخن ہونا ہزاروں بدگمانیاں پیدا کر سکتا ہے اور جس قدر بھی رشک ہو وہ علیحدہ اگرچہ اطمینان ہے کہ عدو اپنی ہم سخنی سے مستفید اور بدآموزی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

لیکن اسے کیا کیا جائے کہ غیر کا ہم سخن ہونا ہی عاشق کے لئے باعث رشک ہے وہ کب گوارا کر سکتا ہے کہ محبوب سے دشمن ہم کلام ہو۔

ہم جب اس شعر کو پڑھتے ہوئے خیالات کی معراج تک جا پہنچتے ہیں تو ہماری

حیرت کی کوئی حد نہیں ہوتی اور فضائے بسیط کی موسیقی میں یہ ترانہ فردوس گوش بن جاتا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

مجازستان عشق و محبت کی حدوں سے آگے بڑھ کر سرحد حقیقت آشنا میں یہ شعر جنت نگاہ بن کر وہ عالم پیدا کرتا ہے جہاں غیروں کی ہم سخنی بندہ کیا خدا بھی نہیں پسند فرماتا۔

غالب کی حقیقت نگاری دیکھنا ہے تو ذرا اس منظر کو یاد کیجئے جب کہ محبوب خدا کی خدمت میں کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو اپنی کسی مصلحت کے ماتحت خصوصیات پیدا کرنے کے لئے ہر وقت گفت و شنید کیا کرتے ہیں ان کے دلوں کا حال خدا خوب جانتا ہے لہذا وہ حکم دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً ذَٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ۔

ترجمہ۔ اے وہ لوگ کہ ایمان لائے ہو جس وقت کہ راز کہو تم پیغمبر سے تو راز کہنے سے پیشتر صدقہ دو۔

احکم الحاکمین کا یہ ایسا حکم ہے جو رسول سے گفتگو کرنے والوں پر ٹیکس لگا دیتا ہے لہذا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو ہر دم رسول کی خدمت میں کن پھوسیاں (نجوا) کیا کرتے تھے مجبور ہو جاتے ہیں۔

سے منافقین۔

کیا عجب ہے کہ شعر میں اسی واقعہ متعلقہ آیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہو ورنہ شعر خود ہی واقعہ کی یاد تازہ کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ غالب کے ایسے ہی بلند پایہ شعر ہوتے ہیں جن کو حل کرنے والے پہاڑوں سے جوئے شیر لاتے ہیں اور نہ سمجھنے والے بیچارے (غالبیت) سمجھ کر لطائف سخن سے محروم رہ جاتے ہیں۔

حُسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

جب معجز نگاری کا یہ عالم ہو کہ ایک ایک شعر ایک ایک مصرعہ میں قلزم حقیقت موجیں لے رہا ہو تو پھر غالب ساخدائے سخن کیوں نہ فخر و مباہات سے کہے۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

یہ غالب ہی کی حقیقت نگاری ہے کہ اگر خاک پر بھی نظر ڈالتے ہیں تو عرش عظیم کی خبر لاتے ہیں۔

گل فشانی ہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری جلوہ کاری ہائے ہائے

غالب کے بلند مرتبہ معرفت آگین اشعار گہرے سے گہرے خیالات کے [illegible] نتائج ہوتے ہیں انھیں کبھی سطحی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے اور نہ عام غزل گویوں کی صف میں غالب کو ڈھونڈھنا چاہیئے ان کا رنگ سب سے علیحدہ اور بالکل [illegible] وہی ہے جو ایک فطری شاعر میں قدرتی طور پر ہونا چاہیئے۔ شاعر کے لئے [illegible] قابل فخر ہوتا ہے کہ وہ اپنا خیال و طرز سخن سب سے الگ رکھے نیز پاکیزہ خیال

بادہ گوئیوں پر قدرت بیان نہ ہونے دے غالب نے ایسا ہی کیا اور وہ خوب کامیاب ہوئے۔

میرزا غالب نے جس رنگ کو اختیار کیا وہ مشکل سے مشکل ہے پاک و باریک خیالات اُن کے طرۂ امتیاز ہیں غزل کے معمولی گنے گنائے چوٹی کنگھی کے دس بیس موضوعات کو نظم کر لینا اَن پڑھ شاعر کے لیے بھی دشوار نہیں لیکن وہ بلند مضامین جنھیں غالب اپنی جدت طرازی و قادر الکلامی سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ ایک ایک بیت اور ایک ایک مصرعہ میں نظم کر گئے ہیں انھیں بڑے بڑے علامۂ دہر بھی جلدی نہیں نباہ سکتے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

غالب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ فارسی الفاظ و ترکیب بہت زیادہ استعمال فرماتے تھے " درست ہے "، لیکن انصاف یہ کہہ رہا ہے کہ بچپن سے جس کی عمر کا بڑا حصہ فارسی کے میدان میں صرف ہوا ہو نیز جس کے خیالات فارسی زبان کی وسعت کے موافق بے پایاں ہو چکے ہوں وہ اپنی منجھی اور چڑھی ہوئی اُن ترکیبوں کو فوراً کیونکر چھوڑ سکتا ہے جس سے اس کا دلی لگاؤ ہو۔ غالب کا اُردو کلام دو حصوں پر منقسم ہے ایک ابتدائی ہے جس میں فارسی کا رنگ غالب ہے دوسرا وہ ہے جسے اُردو کا شفاف آئینہ یا جام جہاں نما کہنا بالکل درست ہے لیکن یہ واضح رہے کہ پہلا حصہ دوسرے حصہ کا پیش خیمہ ہے فارسی کی مملکت سے اُردو کی دنیا میں رسد رسانی کی گئی ہے۔ اس گوشہ پر بھی گہری نظر ڈالنا چاہیئے کہ غالب کے بلند و باریک تخیلات بڑی حد تک

فارسیت کے محتاج تھے اور یہ بھی معلوم کر لینا چاہیئے کہ میرزا کو فارسی زبان سے
زبردست لگاؤ تھا وہ ایرانی النسل تھے ملّا عبدالصمد ایرانی سے فارسی زبان اور اس
کے تمام رموز حاصل کیے تھے یہ غالب کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ فارسی پڑھانے کے
لئے ایرانی اُستاد ملا جس نے فارسیت کا جذبہ اُن کے دل میں بھر دیا۔ حالی مرحوم نے
یادگار غالب میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ میرزا نے گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع
کر دیا تھا اسی ابتدائی زمانہ میں انھوں نے چند اشعار فارسی میں بطور غزل موزوں
کیے اس میں "چہ" کی ردیف استعمال کی تھی جب اُنھوں نے وہ اشعار
اپنے اُستاد شیخ معظم کو سُنائے تو اُنھوں نے کہا یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے
ایسے بے معنی اشعار کہنے سے کوئی فائدہ نہیں اس وقت تو مرزا یہ سُن کر خاموش
رہے۔ ایک روز ملا ظہوری کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک شعر نظر پڑ گیا
جس میں لفظ "دگر چہ" ردیف کے معنی میں استعمال ہوا تھا۔ فوراً کتاب لئے ہوئے
دوڑتے ہوئے گئے اور ملا ظہوری کا شعر سند میں پیش کیا شیخ معظم اُسے دیکھکر کہنے
لگے کہ تم کو فارسی زبان و شعر سے خداداد مناسبت ہے۔ اس واقعہ سے صاف معلوم
ہو جاتا ہے کہ غالب کو فارسی زبان سے کس درجہ تعلق تھا جس کے اظہار سے اُردو
اشعار بھی نہیں بچ سکے۔ اب میں تصویر کا ایک رُخ اور بھی دکھاؤں گا یعنی اُردو میں
غالب کی فارسیت" بیشک غالب نے اُردو میں فارسی الفاظ و ترکیب کا استعمال بہت زیادہ
کیا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ فارسی کو اپنی قدرت سے اُردو بنانے کی کوشش کی ہے کہ فارسی میں اُردو
کی شان پیدا ہو جائے اُردو فارسی کی ہم پلہ ہو جائے یہ وہ راز ہے جس پر عمل کر کے غالب
نے اُردو کو اُردو کر دیا اگر وہ متقدمین کی پیروی کرتے تو اُردو پر اُن کا کوئی احسان نہ ہوتا

انوکھی اور جدت پسند طبیعت تھی تقلید سے ایجاد کو بالاتر سمجھتی تھی فارسی کی روشوں سے حدیقہ اُردو میں وہ گل کھلائے جو آج گل چینوں کے جیب و دامن کی رونق ہیں۔

غالب نے فارسی کو اُردو کس طرح بنایا ایسی مثالیں دیوان میں بہت ہیں گویا غالب نے ایک درس گاہ کھول دی جہاں دل دادگان اُردو کو فارسی کی ایسی تعلیم ملتی ہے جو اُردو کے لئے طرۂ امتیاز ہو جائے۔ فرماتے ہیں۔

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز ۔ لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

کس خوبصورتی سے فارسی کی اُردو بنائی گئی اور کتنی خوش اسلوبی سے رفت و بود کا ترجمہ کیا گیا ہے جس کے دل میں اُردو کا درد ہو وہ غالب کے مکتب میں سبق لے۔

فنا تعلیم درسِ بے خودی ہوں اُس زمانہ سے ۔ کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

غزل

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا ۔ تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے ۔ کشاکش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل ۔ کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ ۔ مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

ان چار شعروں میں سے اگر چار الفاظ "آیا، کو، ہمارا، ہے" علیحدہ کر دیے جائیں اور اُن کے قائم مقام فارسی الفاظ ہو جائیں تو اشعار فارسی ہیں ورنہ اُردو۔

یہی فارسی الفاظ و ترکیب ہیں جن سے اکثر لوگ گھبراتے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ غالب نے اُردو کی آیندہ ترقی کے لئے کیا سامان کیا جو کچھ کیا وہ جانِ سخن، روحِ سخن اور رشکِ سخن ہے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشکِ فارسی ۔ گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

وہی آتشِ عشق کا بھڑکتا ہوا شعلہ جو خرمن ہوش و حواس کو دم بھر میں خاکستر بنا دے سینوں کے اندر رشک و رقابت کی آگ سلگاتا رہتا ہے اس دوہری آگ میں جلنے والے سے کہا جا رہا ہے کہ ترا محبوب اور غیر سے اخلاص حیف صد حیف۔ یہ وہ روح فرسا خبر ہوتی ہے جس سے دنیائے محبت کے ذرّے ذرّے میں قیامت کی آگ لگ جاتی ہے۔

کون ہے جو یہ سن سکے کہ اُس کا محبوب غیر سے خلوص رکھتا ہے اور کون ہے جو ایسا سننے کے بعد اپنے دل میں ذرّہ برابر بھی تسلّی کا وجود پا سکے۔

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں

طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا

لیکن محبوب کی عام بے مہری آڑے وقت میں کام آجاتی ہے عقل ذرا سنبھلتی ہے اور سنبھل کر بتلاتی ہے کہ بھلا وہ بے مہر کس کا آشنا یعنی وہ کسی کا بھی نہیں غیر سے اُس کا اخلاص کیا معنی۔

اس شعر میں لطافت انگیز نکتہ یہ ہے کہ محبوب بے مہر ہے اور اُس کی عام بے مہری کا عاشق کو اچھی طرح علم و یقین ہے اور یہی علم و یقین اُس کی عقل و فہم

کا سہارا ہے حالانکہ محبوب کا بے مہر ہونا بجائے خود عاشق کے لئے ایک جانگداز و روح فرسا امر ہے لیکن اسوقت چونکہ غیر سے اخلاص ہونے کا رشک ہے اور یہ رشک بھی جانکاہ ہے لہٰذا معشوق کی بے التفاتی و بے مہری اُسے دور کر رہی ہے اور اس بات کی ضمانت کر رہی ہے کہ غیر سے اخلاص ممکن ہی نہیں ۔

غور کرنے سے اس شعر میں فلسفۂ اخلاق کا ایک مختصر مگر جامع کلیہ بھی مل رہا ہے محبت اور اخلاص کے ضروری رشتہ پر کافی روشنی پڑ رہی ہے علمائے اخلاق نے خلوص و محبت کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے اور واقعہ بھی یونہی ہے اکسر ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے ایک دوسرے کی اساس ہے محبت کا نتیجہ خلوص اور خلوص کا نتیجہ محبّت ہے ۔

ہو سکتا ہے کہ بناوٹ اختیار کی جائے جیسا کہ خود غرض دنیا میں اکثر و بیشتر ہوتا ہے لیکن اصلیت سے دور محض بناوٹ ہی بناوٹ بجائے خود ضمیر کے لئے یاداش جرم ہے اور چونکہ اُس کا پردہ زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتا لہٰذا بر وقت اظہار بناوٹ ایک لعنت ثابت ہوتی ہے ۔

خدائے سخن حضرت غالب نے معلّم اخلاق کی حیثیت سے غزل کے ایک معمولی سے شعر میں خلوص و محبّت کے فلسفہ کو کس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے جس میں تغزل کا رنگین دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ۔

اخلاقی تعلیم کی ایسی بہت سی مثالیں دیوان کے اندر ہیں جنھیں ترانۂ اخلاق کہا جا سکتا ہے نکتہ بیں نگاہیں غالب کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک نقطہ میں خزانہ ہائے معانی و مطالب دیکھ رہی ہیں غزلوں میں فلسفہ نگاری حقائق

طرازی کے ساتھ تغزل کی نمکینیت کو پورے طور پر برقرار رکھنا آسان کام نہیں ہے مگر غالب اس دشوار گذار میدان میں بڑی آزادی سے رواں دواں ہیں۔

فنون شعر وادب کے وہ جواہر پارے جو شاہدان سخن کے تاج حسن میں ٹانکنے کے لئے بڑی مشکلوں سے دستیاب ہوتے ہیں غالب کے یہاں بکثرت ملیں گے وہی غزل اور وہی شعر جو عام نگاہوں سے بے کیف گذر جاتے ہیں اور خالی نہیں بلکہ غالبیت کا خطاب پاتے ہوئے گذر جاتے ہیں وہ قدرشناس نگاہوں میں پہنچکر دلوں کی گہرائیوں میں جذب وکیف کی دنیا بھر دیتے ہیں۔

اسی کیفیت کی طرف اشارتًا وکنایتًا کہا جارہا ہے۔

ہوئی اِس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

کون کہہ سکتا ہے کہ غالب کے پُرمعانی اشعار دنیائے سخن کے لئے جامِ جم نہیں۔ خود فرماتے ہیں۔

فکر میری گہراندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویاں ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

کلامِ رشک

گذرا اسدؔ مسرّت پیغام یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشک سوال و جواب ہے

قاصد اور رشک ہزاروں بار کا پامال شدہ مضمون ہے شاید ہی کسی شاعر کی دست برد سے بچا ہو ورنہ قریب قریب تمام شعرائے متقدمین و متاخرین نے اس پر طبع آزمائیاں کی ہیں، غالب نے بھی اس مضمون کو نظم کیا لیکن بقول خود۔

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھّے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

غالب کے دیوان میں اکثر ایسے مضمون کے شعر بھی ملیں گے جن پر دوسروں نے طبع آزمائی کی ہے لیکن طرز بیان بالکل جداگانہ اور انوکھا ہوگا کوئی مضمون ایسا نہ ملیگا جو بندش کے لحاظ سے پُرآب وتاب نہ ہوگیا ہو، مردہ مضامین کو زندہ کرنا کوئی سہل کام نہیں لیکن غالب ساخدائے سخن ہو تو مردے سے مردہ مضمون میں روح پھونک دے۔

شعر مندرجہ بالا میں ایک تڑپتی ہوئی اور تڑپا دینے والی روح موجود ہے پیغام یار کی مسرّت سے دست کش ہونا قیامت کی مجبوری ہے اور اس مجبوری کو گوارا کرنا دنیائے عشق میں قیامت بالائے قیامت ہے۔ دوسرے مصرعہ

ہیں کہا جاتا ہے کہ مجھے قاصد پہ رشک ہے اس لئے کہ وہ محبوب سے ہمکلام ہوتا ہے خیر یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے بہتوں کو اس طرح رشک ہوا ہوگا۔ لیکن اتنا رشک کسی کو نہ ہوا ہوگا کہ اس نے یار سے سلام و پیام ہی بند کر دینے کی ٹھان لی ہو اور دل پہ یہاں تک جبر اختیار کیا ہو کہ پیغام یار کی روح پرور مسرت سے اپنے کو آپ محروم کر دیا ہو۔

ذرا اندازہ کرنا چاہیے کہ یہ رشک کس درجہ کا ہے حالانکہ اس بلا کا رشک قاصد سے نہ ہونا چاہیئے وہ کوئی رقیب نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ محبوب سے اور اس سے سوال و جواب کی نوبت آتی ہے یعنی وہ محبوب سے اور محبوب اس سے ہمکلام ہوتا ہے اور یہ کسی طرح گوارا نہیں اب سوا اس کے اور کیا چارہ کار ہے کہ سرے سے نامہ و پیام ہی بند کر دیا جائے اور پیام یار سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے اُسے جبراً قہراً ترک کر دیا جائے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
کہیو مرا سلام اگر نامہ بر ملے

ایک ذراسی بات کو اس قدر طول دینا بدگمانیِ عشق کی بہت بڑی سحر آفرینی ہے جسے کوئی حساس دل رکھتا ہو تو محسوس کرے اور شعر کی اہمیت کو سمجھے کیفیاتِ رشک کو اس اہم طریقہ سے نظم کیا گیا ہے کہ

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

یہی وہ جذبات نگاری ہے جس نے غالب کو دنیائے سخن پر قلم کی روانی سے

غالب کر دیا ورنہ قاصد اور رشک کے روندے ہوئے مضمون میں نہ کوئی دم تھا نہ لطف۔

غالب نے پامال شدہ مضمون کو تاثرات عشق و محبت کی بلندی پر لے جا کر نظم کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں ایک تازہ روح پیدا ہو گئی یہ اُن کی شاعری کا راز ہے کہ اپنے زور طبیعت سے ہر مضمون اور ہر خیال کو بلند سے بلند کر کے نظم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور خوب کامیاب ہوتے ہیں اسی شعر میں دیکھ لیا جائے کہ قاصد پر کس درجہ رشک کیا گیا ہے اسقدر ناقابل برداشت کہ پیغام یار کی مسرّت پر حاوی ہو گیا اور پیغام یار کی مسرّت اُس پر قربان ہو گئی نہیں سمجھا جا سکتا کہ رشک کے شعلے کتنے بلند ہوتے ہیں اور رقابت کی آگ کتنی حرارت رکھتی ہے جب رشک و رقابت کی یہ حالت ہو کہ محض قاصد کے سوال و جواب پر مسرّت پیغام یار قربان کرنے کا جوش پیدا ہو جائے تو پھر محبت کس قیامت کی ہو گی یہ مسلّمہ ہے کہ جتنی محبت ہو گی اُتنی رقابت اور اتنا ہی رشک بھی قاصد سے رشک کرنے میں محبت کے جذبات کو آسمان تک پہنچا دیا گیا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

غالب کے یہاں قریب قریب جتنے مضامین ملتے ہیں وہ یونہی فلک نشین ہیں ان کی طبیعت کہیں بھی نچلی نہیں بیٹھی ہر رنگ میں کمال بالائے کمال دکھا کر دنیائے سخن کو خراج تحسین دینے پر مجبور کر دیا ہے۔

سودائے رشک

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

خانۂ محبوب کا پتہ درکار ہے لیکن رشک کی یہ شدت ہے کہ کسی کے سامنے محبوب کے گھر کا نام نہیں لینا چاہتے ذکر نہیں کرنا چاہتے محبوب کے گھر تک جانا ضروری ہے اب سوا اس کے اور کیا پوچھ سکتے ہیں کہ میں کدھر جاؤں۔

دیوانوں کی طرح در بدر کی ٹھوکریں گوارا ہیں لیکن یہ گوارا نہیں کہ یار کے گھر کا پتہ کسی سے پوچھیں پوچھنے میں ذکر یار دوسرے کے کانوں تک پہنچتا ہے۔

اس شعر میں رشک کی عجیب وغریب دیوانہ وار تصویر ہے کیوں نہ یوں سمجھئے کہ ایک ایسے عاشق کی تصویر لفظوں اور حرفوں میں کھینچی گئی ہے جس کو افراط عشق نے از سرتاپا رشک مجسم بنا دیا ہے اور وہ اپنی اسی کیفیت میں مبتلا ہو کر دیوانوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔

اب اس دیوانے کی باتوں کا کیا ٹھکانہ کون سنے اور کون جواب دے اگر سمجھے اور جواب دے تو قیامت ہے۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

خاموشی اچھی مگر جو دیوانہ ہو رہا ہو وہ کیوں کر چپ رہے دیوانگی میں جو کچھ

منہ سے نکل جائے وہ نکل جائے۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

دیوانگی کی باتیں عجیب وغریب ہوتی ہیں جیسی کہ ہونا چاہئیں دیوانۂ رشک کا حال دیکھئے کہنا چاہئے کچھ مگر کہا جاتا ہے کچھ دیوانہ کی بات کوئی دیوانہ ہو جائے تو سمجھے ورنہ۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کیسی غیرت کی بات ہے کہ ایک ایک سے پوچھا جاتا ہے کہ میں کدھر کو جاؤں کوئی کیا بتائے رشک کی اجازت نہیں کہ دوسرے کے سامنے محبوب کا نام زبان پر آئے اور دوسرا بھی راز عشق سے آگاہ ہو۔

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانہ میں
حریف راز محبت مگر در و دیوار

کیوں کر محبوب کا نام لیا جائے اور کس طرح اُس کے گھر کا پتہ پوچھا جائے مبادا کوئی سن کر اور سمجھ کر جواب دے تو رشک ہو گا کہ اُس کے محبوب کے گھر کا پتہ دوسرے کو معلوم ہے نتیجہ یہ ہے کہ خانۂ محبوب کی طلب اور جوش رشک نے دیوانہ بنا دیا ہے اور غالب نے یہ کمال کیا کہ اس دیوانہ کی تصویر کھینچی جس کی تصویر مانی و بہزاد بھی نہ کھینچ سکتے۔

ایک سہل سی بات اختیار کر لینا ہی دیوانگی کی علامت ہے مثلاً کسی دیوانے

کو یہ دھن سما جاتی ہے کہ بادشاہ وقت میں ہی تھا معزول کر دیا گیا ہوں اکثر
کو یہ جنون ہو جاتا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا علامہ میں ہی ہوں یونہی ہر ایک
دیوانہ و خبط الحواس علیحدہ علیحدہ اپنی دیوانگی کا گویا ایک موضوع پسند اور
مقرر کر لیتا ہے۔

بقدر حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

دیوانگی اور دیوانوں کے عبرت ناک حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس
شعر کی قدر و قیمت بدرجہا بڑھ جاتی ہے کمالات شاعری یہی ہیں کہ مشاہداتِ
عالم کو نئے رنگ میں پیش کیا جائے اور حسب موقع اس میں اتنی شگفتگی و نازکی
پیدا کی جائے کہ فانی سے فانی چیز بھی غیر فانی نظر آنے لگے معجزاتِ سخن میں
اگر یہ طاقت اور یہ قدرت نہ ہو تو وہ خود فنا ہو جائیں۔

دیوانۂ رشک کو دیکھئے اور اس کی بات سنئے کیسی مہمل بات کہی جاتی ہے مگر
دیوانگی کی کتنی صحیح مثال پیش ہوتی ہے بھلا کوئی صاحبِ عقل بھی بغیر تفصیل کے
یوں کہہ سکتا ہے "جاؤں کدھر کو میں"، سچ تو یہ ہے کہ سحر کلامی داد تحسین سے مستغنی
ہے رشک غالب، رشک سودا ہے جس کی ضمیر کے اندر ایک ایسے محبوب کی
تلاش کا جذبہ ہے جس کے گھر کا پتہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

رشکِ طور

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

کوہ طور وہ مقام ہے جہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے معبودِ حقیقی سے دعائیں اور التجائیں کرنے کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے دنیا میں اس کوہ کی عظمت و جلالت مسلّم ہے۔ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ اور قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ کا مکالمہ عبد و معبود کے درمیان اسی پر عظمت و جلالت کوہ پر ہوا موسیٰؑ نے دیدار کی خواہش کی، جواب ملا کہ موسیٰؑ تم نہیں دیکھ سکتے اچھا ذرا اس پہاڑ کی طرف تو دیکھو وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ اُدھر موسیٰؑ کو شوق نے ابھارا اُدھر برقِ طور بے حجاب ہوئی فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا۔ برقِ طور کا چمکنا تھا کہ موسیٰؑ مع اپنے ساتھیوں کے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے اور طور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

غالب اپنے شعر میں اسی برق کے متعلق کہتے ہیں کہ اسے ہم پہ گرنا چاہیے تھا جن لفظوں میں یہ حوصلہ ظاہر کیا جا رہا ہے انھیں لفظوں کے پردہ میں رشک پوشیدہ ہے۔

---

۵ امت کے اسرار سے

غالب اپنی انسانی عظمت کو پہاڑ کی عظمت سے زیادہ بلند و ارفع سمجھتے ہیں اور ا
کے خیال کے مطابق طور کو جو شرف برق سے حاصل ہوا وہ انھیں حاصل ہونا چاہئے تھا
یہی موقع ہے جہاں رشک اپنی پوری معنویت کو ظاہر کر دیتا ہے گو زبان سے لفظ رشک
کا استعمال نہیں کیا جاتا اس لئے کہ شان بشریت نمایاں کرتا ہے اگر ایک پہاڑ کے مقا
میں رشک کا نام لیا جائے تو بشری عظمت پر حرف آتا ہے کس قدر نازک موقع ہے
جس کو غالب کے فن سخن طرازی نے بڑی ہوشیاری سے طے کیا۔
بہرحال مقصد یہ ہے کہ جس جلوہ کو طور برداشت نہ کر سکا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اس
مستحق ہم ہیں اور ہمارا ظرف ہے۔
ساقی جسے بادہ عطا کرتا ہے یا شراب پلاتا ہے اس کے ظرف کا اندازہ کر لیتا
گو کہتے نہیں مگر اشاروں اور حوالوں سے ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارا ظرف کوہ طور کے ظ
سے زیادہ ہے اور ہمارا مرتبہ اس کے مرتبہ سے اعلیٰ ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ　　رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدمبوس کس لئے　　کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

آج کیا ہو گیا کہ ہم ذلیل و حقیر ہو گئے ابھی کل کی بات ہے کہ ہماری جناب ہماری
میں فرشتوں کی گستاخی بھی پسند نہیں تھی۔
تمہاری راہ میں میری آنکھیں بچھی ہوئی ہیں تم میری آنکھوں پہ قدم کیوں نہیں رکھتے

دریغ کرتے ہو مہر و ماہ سے رتبہ میں میں کمتر نہیں ہوں۔
کیوں اور کسو جو سے منع کرتے ہو کہ میرے پاؤں کو بوسہ نہ دو کیا میں آسمان کے برابر بھی نہیں ہوں آسمان تمہارے پاؤں چومے اور میں اس شرف سے محروم رہوں۔

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

پیام اسریٰ کی وہ تھوڑی سی رات یاد ہے جب عرش کی سیر کی گئی اور آسمانوں نے بار بار قدم چومے یہی یاد دل میں رشک بن کے لپٹی رہے۔
آسمان قدم چومے طور جلوہ سے منور ہو مہر و ماہ کسب ضیا کریں اور ہم محروم جلوہ رہیں۔
دعوے ہیں اور پُر زور دعوے ہیں کہ وہ برق جو طور پہ گری اس کی تجلّی کے ہم مستحق ہیں وہ شراب جلوہ جو طور کی چوٹی پہ برسائی گئی اُس کے لئے ہمارا ظرف مخصوص ہے کیوں کہ ہماری خلقت اور ہماری طینت میں وہ شراب روز ازل سے شامل ہے۔

وہ ہوا غرقہ کہ بخت رسا رکھتا ہے — سر سے گذرے پہ بھی ہے بال ہما موج شراب
بقدر روح بناتی ہے جگر تشنۂ ناز — دے ہے تسکین بدم آب بقا موج شراب

مقصد یہ ہے کہ انسان شراب جلوہ کا زیادہ مستحق ہے اس لئے ساقی جلوہ سے اندازۂ ظرف کا پُر کیف مطالبہ ہے۔

---

۵ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ ۔ الخ۔ اشارہ ہے اس عقیدہ کی طرف برق طور میں جلوہ محمدی تھا۔

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ایسا نہ ہونے سے جو زیادہ مستحق ہیں انھیں اگر شکایت نہیں تو رشک ضرور ہوگا اس شعر میں غالب نے غزل کی رنگینیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا رشک کی درپردہ شوخی سے بہت سنبھالا ہے حق یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات کے ازلی ابدی حقوق اور اُن کی فضیلت وجلالت کو ظاہر کرنے کی بہترین کوشش کی اور کامیاب ہوئے بہت صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ برق جو طور پہ گری اُس کا حوصلہ انسان ہی کے دلوں کے لئے ہے۔

جاہل قوم نے حضرت موسیٰ علی نبینا سے دیدار خدا کا مطالبہ کیا تھا اور کہا تھا کہ ہم تو اس وقت تک تمہارے خدا پہ ایمان نہ لائیں گے جب تک آسے دیکھ نہ لیں گے اس مطالبہ کے سلسلہ میں جو کچھ آغاز انجام ہوا اُس کا مختصر تذکرہ تمہید میں آچکا ہے یہاں اتنا اور بتا دوں کہ موسیٰ کے ساتھ جانے والے بقول مؤرخین ستر اشخاص صرف بے ہوش ہی نہیں ہوئے تھے طور کی چوٹی سمیت جل کر فنا ہو گئے تھے مگر حضرت موسیٰ کی دعا سے انھیں خدا نے پھر جامۂ حیات عطا فرمایا تھا۔ کیا اس جلوۂ بے پناہ کی خواہش کسی انسان کے دل میں نہیں ہوسکتی اور کوہ طور کی خوش بختی پر رشک نہیں کیا جاسکتا مگر۔

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حُسن کا

جوشِ بہار جلوہ کو جس کی نقاب ہے

رشکِ دید

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

رشک ہمیشہ دوسروں سے کیا جاتا ہے اپنے سے آپ رشک بالکل انوکھی اور اچھوتی بات ہے غالب نے ایک ایسے حساس دل کا پتہ دیا ہے جو قیامت کا رشک کرنے والا ہے اب اس سے زیادہ اور کیا رشک کیا جائے گا کہ اپنے آپ کو بھی نہ چھوڑا۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

عشق کی یہ بے مثال غارت گری ہے کہ محبوب کا دیدار نصیب ہوا تو اُس کی انتہائی عظمت کے سامنے اپنی حقیقت کا راز کھُل گیا اپنی ہستی ٹھیک تر نظر آنے لگی لہذا اس کامیابی پر کہ دیدار محبوب نصیب ہوا رشک ہو رہا ہے۔

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے　　دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں　　طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

شعر مافوق میں لفظ قسمت پوری توجہ کا مستحق ہے اس لفظ کے اندر موقع اور

محل نے دلدوز کیفیتیں بھر دی ہیں جذبات قلبی نامرادی کے مزوں میں ڈوبے جارہے ہیں قسمت کا اس سے زیادہ کیا ظلم ہوگا کہ دیدار محبوب دمطلوب سے محروم رہ گئے اور محرومیت بھی اس قیامت کی جو کامیابی سے پیدا ہو۔

کیا قسمت ہے کہ محبوب جلوہ گر ہوا تو اب اُسے دیکھا نہیں جا سکتا اپنے پہ آپ رشک ہو رہا ہے۔

یہ رشک جتنا انتہائی ہے اُتنا ہی لطیف بھی ہے ہو سکتا ہے کہ انسان کا نفس پاکیزہ کسی بڑی کامیابی پر بجائے فخر و مباہات کے رشک کرے محبوب کا دیدار دنیائے عشق میں بڑی سے بڑی کامیابی ہے فخر و مباہات کی اہمیت اس کے لئے ناکافی ہے ایسی حالت میں کامیاب عاشق سے دور نہیں کہ وہ اپنے پہ آپ رشک کرے مگر یہ بھی قسمت کا شگوفہ ہے کہ اچھی خاصی کامیابی سے ناکامی کا پہلو پیدا ہو

میں نامُراد دل کی تسلّی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہہ کامیاب ہے

سچ تو یوں ہے کہ ایسے ہی لطیف ترین مضامین کی ایجاد و اختراع کے لئے غالب کے دل و دماغ کی تشکیل ہوئی تھی ہیں تو بیت متذکرہ میں جذبات کے وہ نکات ملتے ہیں جو دلوں کے لئے تیر و نشتر ہیں۔

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

رشکِ تمنّا

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

رشک دید کے بعد رشک تمنّا اور بھی اہم تر ہے بیت گزشتہ کے بعد حاضرہ کو پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ احساسات شعری نے کمال بالائے کمال کیا ہے جذباتِ عشق میں قیامت پر قیامت اور حشر پر حشر برپا ہے یہی ہنگامہ پروری غالب کے زور طبیعت کا طرۂ امتیاز ہے۔

ہو سکتا ہے کہ محبوب کے حسن وجمال کی سحر سازی عاشق کے دل میں خود اسی کے لئے رشک پیدا کر دے اور بامراد عاشق اپنی کامیابی کو نامرادی و محرومیت پر ترجیح نہ دے سکے محبوب کے دیدار سے اپنے پر آپ رشک پیدا ہو لیکن تمنّا تو دل میں چھپی ہوتی ہے یہی بنیاد عشق ہے جس پر تعمیر عشق کا دارو مدار ہے ایسی حالت میں کہا جا سکتا ہے کہ دیدار سے تمنا بہت زیادہ اہم ہے مگر عشق گزیں دل کی خلش بتاتی ہے کہ رشک تمنّا سے بھی آگے ہے یعنی تمنّا سے بھی بڑھ کے ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ محبوب کی تمنّا عاشق کی زندگی نہیں لیکن موت کے بہانے کو کیا کہا جائے کہ مرتے ہیں مگر رشک کی وجہ سے محبوب کی تمنّا نہیں کرتے جان تو عشق میں جا رہی ہے لیکن معشوق کی تمنا نہیں کرتے اس لیے کہ اپنے پہ آپ

رشک گوارا نہیں خدا جانے کس بلا کا رشک اور کس انتہا کا عشق ہے اس رشک کا اندازہ تو شاید وہی لگا سکے جس کو جذبات عشق کی قیامت خیزیوں کا مذاق حاصل ہو ورنہ غالب کے تخیلات کی حدوں کو کون پہنچ سکتا ہے۔

کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز　　کس نے پایا اثر نالۂ دلہائے حزیں
نقش معنی ہمہ خمیازہ عرض صورت　　سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوق تحسین

سامع زمزمۂ اہل جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگ ستائش نہ دماغ نفریں

اس تخیل کی کون داد دے سکتا ہے کہ محبوب کی تمنا سے رشک پیدا ہوتا ہے آرزو سے غیر کی کیا حقیقت اپنی تمنا پر رشک اور ایسا رشک جس کے آگے موت بھی ہیچ ہے۔

تمنا نہ کرنے کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے اُسے برداشت کرنے کے لئے یعنی مرنے کے لئے آمادہ لیکن رشک کی چوٹ دل پر نہیں اُٹھائی جا سکتی اس لئے کہ اپنی ہی ذات سے پیدا ہے اپنی ہی آستین کا پلا ہوا سانپ ہے کون اس کے زہر سے بچ سکتا ہے۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

Tafazzul Husain

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

دنیائے محبت کی آخری تمنا اور آخری مسرت یہ ہے کہ عاشق اپنے معشوق کی تلوار سے قتل ہو کر حیات جاوید حاصل کرے قتل ہونے کے لئے ہزاروں تمنائیں اور لاکھوں آرزوئیں کی جاتی ہیں۔

عشرت پارۂ دل زخم تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرق نمکداں ہونا

راہ محبت میں قربان ہو جانا یہ وہ دائمی کامیابی دائمی مسرت اور دائمی عید ہے جس کے لئے ہر سچا عاشق بے تاب ہوتا ہے۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

اگر معشوق انتہا درجہ کی مہربانی کر کے تلوار کھینچ لے تو ہم عشاق نذرانہ ہیں اگر شفقت ابدی کے ساتھ گردن پہ خط کھینچے تو کاٹ کرم کی لذت اندوزکشش ہیں دو عالم کے مرنے ہیں اگر بالفرض گردن کا فیصلہ کر دے تو عشق کی پوری کامیابی اور عاشق فنافی العشق ہو کر دنیائے محبت پر فتحیاب ہو جائے ہزار ہزار مسرت کا وقت ہے لاکھ لاکھ عید کی ساعت ہے معشوق تلوار کھینچے ہوئے آ رہا ہے لیکن ایسے

پُر مسرت وقت ہیں جب کہ تمام تمنائیں پوری ہو جائیں گی محبت کے تمام ترصلے ملنے والے ہیں، ابدی کامرانی وکامیابی حاصل ہونے والی ہے معشوق کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر رشک کیا جا رہا ہے اپنے قتل پہ آپ رشک ہو رہا ہے معشوق نے قتل کرنے کا ارادہ کیا عاشق کے لئے اس کا ارادہ شادیٔ مرگ ہو رہا ہے ہاتھ میں تلوا بقول حضرت غالب عید نظارہ ہے عاشق کیف مسرت سے چور ہے لیکن اسی عالم میں اُسے رشک پیدا ہوا ہے اور اتنا شدید جو پیامِ مرگ ہے۔

اس موقع پر ایک بات ذرا احساس کے قابل یہ ہے کہ عاشق کے لئے کون سی موت قابل ترجیح ہے آیا محبوب کی تلوار سے یا رشک کی تلوار سے۔

محبت اور ذوق شہادت کی انتہائی لذت خیزیاں شاہد ہیں کہ محبوب کی تلوار سے رشک کی تلوار زیادہ لذت بخش ہے کیوں کہ اس سے بلند ترین شان محبوبیت اور محبت کا انکشاف ہوتا ہے ورنہ معشوق کی تلوار سے قتل ہو جانا تو دنیائے عشق کا معمولی سا کام ہے۔

معشوق کے ہاتھ میں تلوار دیکھکر اور یہ جان کر کہ وہ میرے ہی قتل کو آرہا ہے رشک کی تلوار سے قتل ہو جانا جذبۂ عشق کی بہت بڑی تعریف ہے۔

اختلاف خیال کی ایک تصویر یہ بھی ہو کہ محبوب کے ہاتھ میں دیکھکر تلوار سے رشک کیا جارہا ہے

سادگی پر اس کے مرجانے کی حسرت دل میں ہے   بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

باوجود کہ دست محبوب کی تلوار گلوے عاشق کے لئے ہے لیکن عاشق رشک سے جاں بلب ہے کیوں کہ جی تو سادگی پہ مرنے کو چاہتا ہے اور جان لینے کے لئے خنجر آمادہ ہے یہیں سے رشک کی بنیاد ہے۔

مدفونِ رشک

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

محبت کی راہ میں قتل ہو جانے کے بعد پھر اگر کوئی آرزو پیدا ہو سکتی ہے تو یہ کہ شہیدِ عشق کی قبر کوچۂ محبوب یا رہ گذرِ یار میں ہو یہ وہ کامیابی ہے جس کی تمنا ہر ایک عاشق اور ہر ایک شہیدِ عشق کے دل میں ہوتی ہے اور ہونا چاہیئے مرنے کے بعد محبوب کے در پہ اگر دو گز زمین مل جائے تو اس سے بڑھ کر دوسری کونسی سلطنت ہاتھ آئی۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیا کم ہے کہ آتے جاتے محبوب کی ٹھوکر سے قبر کے اندر عاشق کا دل زندہ ہوتا رہے اور عشق کی لذت اسی نوع سے تازہ رہے لیکن وہ دل جو بات بات میں رشک کرتا ہو یہاں بھی نہیں چوک سکتا کیوں کر چوکے اور کس طرح بھولے جبکہ وہ رشک کا مجسمہ ہو چکا ہے اور رشک اس کی دوسری زندگی ہے۔

کون سی ایسی اپنی کامیابی ہے جس پہ رشک نہیں کیا گیا۔

دیدارِ محبوب پہ رشک۔ اپنے پہ آپ رشک۔ اپنی تمنا پہ رشک۔ محبوب کے ہاتھ سے قتل ہونے پہ رشک۔ غرض ایک جان ہزار بلا ایک دل ہزار رشک۔

کیسے ممکن ہے کہ قتل ہونے کے بعد محبوب کی گلی میں دفن ہونے کے خیال سے کوئی انوکھا سا رشک نہ پیدا ہو یہ ایسی فردگذاشت نہیں ہے جو کسی سچے عاشق کے دل

سے ہو سکے لہذا محبوب کو منع کیا جاتا ہے کہ مجھ کو قتل کے بعد اپنی گلی میں دفن نہ کرنا اس لئے کہ میرے مدفن کا نشان تیرے گھر کا پتہ ہو جائیگا اور جب خلق خدا کو میرے پتہ سے تیرا گھر ملے گا تو مجھے رشک ہوگا۔

کس غضب کا رشک ہے کشتۂ عشق کے پتہ سے اُس کے معشوق کا گھر تمام خلق کو ملے وہی دل اور وہی رشک آفریں دل تو ہے جو محبوب کے گھر کا پتہ چاہتا ہے مگر کسی سے پوچھتا نہیں دیوانوں کی طرح کہتا ہے "جاؤں کدھر کو میں"۔

یہی وہ مقامات ہیں جہاں غالب کے خیالات کی شاخ در شاخ ترقیاں ملتی ہیں ایک ایک عنوان کو کس کس رنگ اور ترقی سے نظم کرتے ہیں محبوب کے ہاتھ سے قتل ہونے میں رشک کی انتہا ہو چکی تھی مگر خیال کب نچلا بیٹھتا ہے محبوب کی گلی میں دفن ہونے میں بھی رشک پیدا ہو گیا اور کتنا قیامت خیز رشک ہے جذبات عشق کی دنیا میں ایک زلزلہ اور تہلکہ ہے۔

عاشق کا دل کب گوارا کر سکتا ہے کہ وہ خلق کے لئے معشوق کے گھر کا پتہ بن جائے اور پھر ایسی حالت میں کہ خود ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا ہوا مجبوریوں کی قید میں قیامت تک کے لئے گرفتار جب اس کے پتہ سے لوگوں کو خانۂ محبوب کا سُراغ ملیگا تو اُس پر کیا گذریگی اور دل کیا کہیگا۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

بانگِ رشک

رشک ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دَم ہے ہم کو

کوئی عاشق ہجراں نصیب و درد رسیدہ کبھی گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کے نالہ و فریاد کے مقابلہ میں کوئی دوسرا بھی نالہ و فغاں کرے اس کے نالہ و فریاد کی تاثیر سے دوسرے کے نالہ و فغاں کی تاثیر حائل یا متصل ہو اگر ایسا ہوگا تو یقیناً رشک بھی ضرور ہوگا اسی لئے تو کہا جاتا ہے۔

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا وے طالب تاثیر بھی تھا

کیسے اور کیونکر قبول کیا جائے کہ غیر کے نالے میں تاثیر ہو رشک کی تو یہاں تک دل پہ حکومت ہے کہ مرغ سحر کا نالہ بھی پسند نہیں۔

شب فراق نالہ و فریاد کرنے والوں کی ہمنوائی کون کرسکتا ہے۔ بجز مرغ سحر جس کی بانگ حزیں صبح کے سہانے وقتوں میں جذبات لطیف کو ٹھوکریں دیتی ہی صبح کا وقت گداز قلب کے لئے قدرتی طور پر مخصوص ہے اس وقت اگر ذرہ برابر بھی کسی آواز میں درد ہوگا تو قلوب کے لئے بے چینی کا باعث ہو جائیگا ہر وہ صدا جس میں سوز و گداز کی تیزی ہوگی کائنات دل کے لئے تیغ ہو جائے گی۔ ان قدرتی

اثرات کے ماتحت کسی نالہ کش کے دل میں ہم طرحی سے جذبۂ رشک کا پیدا ہونا اور بھی زیادہ ممکن ہے۔

مرغ سحر سے رشک کرنا یا اس کے نالہ کو تیغ دودم کہنا بظاہر ایک معمولی سی بات یا رنگ غزل کی شوخی ہے لیکن ماحول و موقع کا لحاظ بتائیگا کہ یہ فطری کیفیت ہے اور قلبی واردات ہے۔

غالب نے اپنے شعر میں مرغ سحر کا نام لے کر سحر کی اُن تمام کیفیتوں پر اک اجمالی روشنی ڈالی ہے جن سے دنیا روزواقف ہوا کرتی ہے غالب چوں کہ شاعر ہیں اس لئے ان کیفیتوں کو اپنی رنگین نوائیوں میں اُچھال رہے ہیں عظمت فروزد ناقابل انکار حقیقتوں کا مخصوص انداز کے ساتھ انکشاف کر رہے ہیں۔

ممکن تھا کہ بجائے مرغ سحر کے مرغ چمن یا اسی وزن وشکل کا دوسرا کوئی لفظ یہاں استعمال کیا جاتا اور شعر میں بظاہر کوئی خرابی نہ ہوتی لیکن میرا یہ خیال شاید ناقابل تردید ہو کہ شعر غارت ہو جاتا یا اُن ہمہ گیر کیفیتوں کو نہ جمع کرسکتا جو ایک لفظ سحر میں اس طرح پیوست ہیں جیسے کوزے میں دریا۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

زیادہ بتانے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں ہر شخص جانتا ہے کہ سحر کے وقت کو دلوں کے گداز سے کتنا تعلق ہے یہی وقت اور اسی وقت کا پیدا شدہ گداز دل ہے جس کے ساتھ دل کی دعائیں بارگاہ اجابت تک رواں دواں ہوتی ہیں عاشق کے نالے بھی اسی وقت زیادہ سے زیادہ موثر و تیز ہوتے ہیں اور سلتنے اثرات پیدا کرتے ہیں کہ

نالۂ دل نے دیئے اوراق لخت دل بباد
یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

یہی وقت سحر ہے اور اسی وقت کا اعجاز ہے کہ مرغ کی آواز بھی اپنے سوز و گداز کی جمعیت کے ساتھ نالۂ عاشق سے ہمطرحی کا دعویٰ کرتی ہے اور اپنی تاثیرات کی مدعی ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ عاشق کے دل سے رشک کی فریاد نہ پیدا ہو۔

نالۂ عاشق بھی دل کی دعا اور نالہ مرغ سحر بھی دونوں کسی محبوب کے فراق میں سرگرم کار ہیں اسلئے جتنا بھی رشک ہو کم ہے۔

بانگ حزیں کے درد و اثر کی ہم آہنگی اور فراق نصیبوں کے دلوں کی یکساں غمگینی گداز سحر میں ڈوب کر اتنا سر تیز رشک پیدا کرتی ہیں کہ گویا تیغ دو دم ہیں کن کن لفظوں کی تشریح کی جائے اور کس کس نکتہ پر روشنی ڈالے سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا موقع دے تو غالب کے دیوان کی شرح کرنے میں کئی زندگیاں صرف ہو جائیں۔

میں غور کرتا ہوں کہ غالب نے تیغ دو دم کا نام کیوں لیا کیا صرف قافیہ کی مجبوری تھی ایسا ہرگز نہیں ہے غالب سا قادر الکلام کسی قافیہ کو استعمال کرنے کے لئے خواہ مخواہ مجبور نہیں ہو سکتا۔ اگر غالب قافیہ پیمائی کرتے تو یہ عالم کہاں ہوتا۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سنکر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

غالب جوہر شناس اور سپہ گری کے مدعی تھے تیغ دو دم کو خوب جانچ اور پہچان کے استعمال کیا اب اُن کا وار بھلا اثر سے کیوں خالی جا سکے جو میدان سامنے آئیگا وہ جلتا ہوا جو جسم پڑے گی وہ سر ہو کے رہیگی جہاں رجز کی ضرورت ہوگی وہاں

یوں گل افشانی کی جائے گی۔

آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعر نغز گوئے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیئے — ہے قلم میرا تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد

قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

اب ذرا اس تیغ دو دم کا جوہر دیکھا جائے جسے غالب نے مناسب ترین محل پر استعمال کیا ہے۔

نالۂ عاشق ہو یا مرغ سحر کی بانگ حزیں دونوں کے اثرات میں وہ کاٹ اور وہ تیزی ہوتی ہے کہ دل کھول کے انھیں تیغ کہیے، تلوار کہیے، خنجر کہیے لیکن تیغ دودم کہنا اسی وقت مناسب ہوگا جب کہ دوہرے نالے اور دوہرے اثرات ہوں۔ کہا گیا ہے کہ :۔

رشک ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگ حزیں

صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ بانگ حزیں کی ہم طرح کوئی دوسری آواز بھی ہے جسے فریاد عاشق کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے اگر فریاد عاشق بانگ حزیں کے ساتھ نہیں ہے تو پھر ہم طرحی کیا معنی اور رشک کیسا۔

یہی بانگ حزیں اور یہی فریاد ہم طرح یعنی ایک دوسری سے مل کر تیغ دودم کا جوہر ہو گئی ہیں اس ایجاد کا سہرا محض رشک کے سر ہے۔

دوہرے نالے اور دوہری تاثیروں کی تعبیر تیغ دودم سے کی گئی یہ کوئی معمولی

تصرف نہیں یہ وہ تصرف ہے جس کا حق عام نہیں خاص ہے۔
ایک ایک لفظ سے دفتر کا دفتر کھول دینا ایک ایک قطرہ سے دریا کا دریا بہا دینا ایک ایک ذرہ میں دنیا کی دنیا سمو دینا غالب کی شاعری کا اعجاز ہے تقید کر رہے ورنہ اس شعر کو دوبارہ نہ پڑھتا۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیو
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

کیا شک ہے کہ غالب کے بلند پایہ اشعار میں الفاظ نہیں گنج ہائے معانی ہوتے ہیں غالب اہلِ زبان تھے لفظوں کا استعمال اُن کا حق تھا یہی حق جس کو نصیب ہوتا ہے وہ اصل معنوں میں شاعر و سخن داں کہا جاتا ہے۔
اسی بانگ رشک میں دیکھا جا سکتا ہے کہ گنجینۂ معنی کی حقیقت کس طرح سموئی ہوئی ہے۔ رشک ہمطرحی۔ دردِ اثر۔ بانگ حزیں۔ نالۂ مرغ سحر۔ تیغ دو دم۔ جذبات۔ اثرات۔ حقایق و معانی کے چار خزانے ہیں۔

چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سُو
موجِ گُل۔ موجِ شفق۔ موجِ صبا۔ موجِ شراب

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے
رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

آشفتگی یا دیوانگی کی اس سے زیادہ کیا ترقی ہوگی کہ ایک آشفتہ سر کو زندانیوں کی نام نہاد آسائش پہ رشک ہو رہا ہے حالانکہ آشفتہ مزاج کبھی نہیں چاہتا کہ قید و بند کی زندگی نصیب ہو۔ دیوانگی تو حد سے گذری ہوئی آزادی کا دوسرا نام ہے دیوانے کو قید کی پابندی سے کیا مطلب، کیا غرض اور وہ قیدیوں کی زندگی کو کیوں اچھا اور اس قدر اچھا سمجھے کہ اُسے رشک ہو۔ لیکن واقعہ یوں ہے کہ ہر شے کی ترقی جب اپنی حد سے آگے بڑھ جاتی ہے تو اُس کا عالم کچھ اور ہی ہو جاتا ہے آشفتگی اور اس کی آزادی انتہا سے زیادہ ہو چکی ہے آخر ویرانوں اور صحراؤں کی ٹھوکریں کبتک اور کہاں تک ذوقِ دشت نوردی نے بادیہ پیمائی و دربدری کی تمام لذتوں کو ختم کر دیا۔ دعوت اطفال کے لئے سر و سنگ کا وصال کب تک اور کہاں تک ہاتھ تھک گئے قوتیں سلب ہو گئیں۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

جب دربدری کی انتہائی لذتیں ختم ہو چکی ہیں اور آشفتگی کی ترقی داد سے مستغنی ہو رہی ہے تو اب زندان میں لذت محسوس ہو رہی ہے دیوانے کا ٹھکانہ یا دربدری

یا زنداں جب در بدری کی تمام ٹھوکریں ختم ہوگئیں تو اب زنداں میں آسائش معلوم ہوتی ہے اور زندانیوں کی آسائش پر رشک ہو رہا ہے آشفتگی کی انقلاب انگیز ترقی ہے کہ صحرا سے نکال کر زنداں میں لے جانا چاہتی ہے کون اس آشفتگی کی داد دے سکے دیوانگی اور قید و بند کی لذتوں میں ڈوبنا چاہیے خدا جانے کس بلا کی دیوانگی ہے اور کس قیامت کا یہ رشک ہے جو آشفتہ حال کو زنداں میں بٹھانا چاہتا ہے غالب نے اس شعر میں ذوق آشفتگی کی عجیب و غریب مجنونانہ کیفیت نظم کی ہے جس میں رشک پوری شان سے کارفرما ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ رشک ہی جنون کی شان بدل رہا ہے صحرا سے زنداں میں لے جانا چاہتا ہے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

خدا جانے یہ رشک بھی کیا چیز ہے کہیں اور کسی حالت میں بھی دور نہیں ہوتا دیوانوں اور آشفتہ حالوں کو بھی نہیں چھوڑتا بلکہ آشفتہ مزاجوں کے لئے خود بھی آشفتہ مزاج ہو جاتا ہے دنیا جہاں سے علیحدہ اور عجیب و غریب جذبات پیدا کرتا ہے ہر جگہ ہر نگاہ کے سامنے فَضَّلْنَا بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ کا دلکش منظر پیش کرکے دیوانہ بنا دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت غالب نے اِسے متعدد و مختلف رنگوں میں نظم کیا ہے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھسا کہیں جسے

رشکِ زُنّار

کیوں رشک سے مر جاؤں نہ جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آئے

بڑا پیچیدہ رشک ہے جس میں پیچ در پیچ لطافتیں ہیں۔

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرّۂ پُر پیچ و خم کے پیچ و خم نکلے

کہاں کہاں اور کس کس سے رشک کیا گیا اپنے اور بیگانے سے تو رشک تھا ہی زنّار بھی اس زد سے نہ بچا سچ ہے کہ عشق حسن کو سب سے علیحدہ رکھنا اور دیکھنا چاہتا ہے حلقۂ خمِ زنّار کی آغوش اور محبوب کا تنِ نازک رشک کی تو اب کوئی حد ہی نہیں نظر آتی۔

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بے درد نظرگاہِ حیا ہے

زنّار کی آغوش نے کبھی شوخی کی تنِ نازک کو لے لیا خدا جانے کہ عشق کے دل پر گذرے احساس کی نزاکت بھی کتنی لطیف ہوتی ہے صرف ایک لفظ آغوش ہے لیکن

مستیٔ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

غالب نے اپنی طبیعت کا کتنا شوخ اور گہرا رنگ دکھلایا ہے جس میں پاکیزہ جذبات

کی تمام روحیں بنا رہی ہیں۔

تن نازک اور غیر کی آغوش رشک و رقابت اگر سامانِ مرگ نہ پیدا کرے تو اور کیا کرے رشک بھی وہ رشک جو بیسیوں طرح سے جان لینے کے لئے ہر وقت آمادہ ہو دیکھئے تو سہی کہ رگ ہائے جذبات کو چھیڑنے کے لئے یہاں کونسا نشتر ایجاد کیا گیا ہے۔ایک پتلا سا ڈورا جس نے معشوق کو خود اُسی کی مذہبی قید میں گرفتار کر دیا ہے اس بلا سے کیوں نہ رشک ہو۔

کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

ایک دھاگے کو خیالات کی بلندی نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا یہ بھی اس قابل ہو گیا کہ مرنے والا رشک سے مر جائے اُس کی آغوش اور جلوۂ نازدہ موقع ہے کہ رشک اپنی پوری طاقت سے دلوں کی دنیا تباہ کر سکتا ہے کس کی نگاہیں دیکھ سکتی ہیں کہ محبوب اور غیر کی آغوش میں حلقۂ زنّار ہی کی آغوش سہی۔

کتنا زبردست رشک ہے محسوسات عشق کی بے چینی و بے تابی کی انتہا نہیں۔

یہی وہ جذبات کی موشگافیاں اور سخن طرازیاں ہیں جو غالب کو خدائے سخن کہلاتی اور منواتی ہیں جس مضمون اور جس موضوع کو اُٹھایا اُسے آسمان تک پہنچایا۔زنّار کے حلقہ کو آغوش بنانا اور اس آغوش میں مناسب ترین الفاظ کے ساتھ تن نازک کا ذکر کرنا خیالات کی اہم سے اہم اور بلند سے بلند تر اوشیں ہیں۔

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم

لے لیا مجھ سے مری ہمّت عالی نے مجھے

بلائے رشک

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

معشوق کی ہمہ گیر ادا تمام جہان کے لئے بلائے جان ہے عاشق کے لئے دوہری بلا ہے
ایک تو معشوق کی ادا اور دوسری آفت رشک چاہتا ہے کہ محبوب کی بلائے جان ادا
صرف اُسی تک محدود رہے مگر یہ ممکن نہیں لہذا دوسری آفت بھی اُس کے لئے لازمی ہے
تمام دنیا سے اُس کو رشک کرنا پڑا اس لئے کہ معشوق کی ادا ایک دو کے لئے نہیں ہے
جہاں بھر کے لئے ہے کتنا وسیع رشک ہے جتنی وسعت معشوق کی ادا میں ہے اُتنی ہی عاشق
کے رشک میں بھی ہے بلائے جان ادا اور آفت رشک میزان خیال میں برابر تل رہی ہے۔
کس خوبصورتی سے رشک کی ہمہ گیری ظاہر کی گئی ہے معشوق کی عالمگیر ادا کے ساتھ ساتھ
عالمگیر رشک بھی ہے اب اگر کوئی تمام دنیا کا جائزہ لے ذرہ ذرہ اور قطرہ قطرہ کا جمع و خرچ
دیکھ سکے تو اس رشک کا بھی اندازہ کرے جو ایسی ادا کے ساتھ ہے کہ محدود نہیں ہو سکتی۔
آخر اس خیال کی حد بھی ہے اس رشک کی انتہا بھی ہے یا نہیں مگر کیسی حد اور کیسی انتہا یہ غالب
کی اُس لامتناہی تخیل کے سب کرشمے ہیں جو ہر ذرہ کو دنیا اور ہر دنیا کو خوش اسلوبی سے
مینو سواد بنا دیتی ہے۔ بلائے جان ادا اور آفت رشک سے شعر کی دنیا کیسی خوبصورت
بنائی ہے۔ زبان کی لذت طرز ادا کے چٹخارے بندش کی ندرت خیال کی ہمہ گیری بلائے
رشک میں کیا نہیں ہے جو شاہد سخن کی روح نہ ہو۔

تماشہ کہ اے محو آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

رشکِ بلا

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو　　کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

طالب اپنے مطلوب سے کہہ رہا ہے تم خواہ قہر ہو خواہ بلا ہو جو کچھ بھی ہو کاش ایسا ہوتا کہ تم مخصوص میرے لئے ہوتے دوسرے کے لئے نہ ہوتے۔ حسرت بھی ہے رشک بھی ہے حسرت اس طرح پر کہ محبوب مخصوص طور سے اپنے لئے نہیں۔ رشک بھی اسی خیال کا دوسرا پہلو ہے یعنی وہ دوسروں کے لئے بھی ہے رشک کا پہلو زیادہ اہم ہے یا حسرت کا اس کا فیصلہ کیا ہو سکے جبکہ غالب کے دوہرے خیال کا انوکھا عالم ہو طبیعت کی دوہری قوتیں ایک ساتھ سحر آفرینیاں کر رہی ہوں یہ بھی قادر الکلامی کا اعجاز ہے کہ ایک خیال سے دو دو خیال پیدا ہوتا ہے

اس شعر میں قابل رشک جو الفاظ ہیں وہ قہر و بلا ہیں اس معجز بیانی کو ہزار آفریں کہ قہر و بلا کو رشک و حسرت کے قابل بنا دیا۔

ایک طرف تو معشوق کو قہر و بلا کہہ کر اُسے ہمہ گیر بنا دیا دوسری طرف عاشق کو انتہا درجہ کا شوق مند ثابت کیا۔

ذرا ترغیب عشق تو دیکھئے۔ خودداری تو دیکھئے "میرے لئے ہو" قہر ہو یا بلا ہو۔ اور حسرت کا عالم بھی ملاحظہ ہو "کاش تم میرے لئے ہوتے رشک کی قیامت پر بھی ایک نظر" کاش تم صرف میرے لئے ہوتے" ایک شعر میں کتنے خیالات اور کتنے جذبات نظم ہیں یہاں ایک کوزے میں کئی دریا موج زن ہیں کوئی ان دریاؤں میں شناوری کرے تو۔ وہ گہر لے پُر آب و تاب ہاتھ آئیں گے جن پر دنیا ئے سخن فخر کرے گی۔

ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں　　ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

انتہائے رشک

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

کافر معشوق مدعی کا ہم سفر ہوا ہے جذبات عشق میں قیامت برپا ہے مدعی یعنی رقیب کے ساتھ محبوب کا ہونا انتہا درجے کے رشک کا باعث ہے مگر اس سے بھی زیادہ رشک کا پتہ دیا جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ وہ کافر مدعی کا ہم سفر ہوا ہے جسے خدا کو بھی سونپنے میں رشک ہوگا مدعی کے ساتھ معشوق ہے یہ ایک قیامت ہے دوسری قیامت یہ ہے کہ خدا کو سپرد نہیں کر سکتے۔ اگر سپرد کرتے ہیں تو رشک ہوتا ہے۔

ایک لفظ کافر کی گوناں گوں کیفیتوں میں رشک ڈوبا ہوا ہے اس کو یوہیں ڈوبا رہنے دیجئے۔

حُسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ہے   آئینہ زانوئے فکر اختراع جلوہ ہے

غالبؔ نے اپنی انتہائی بلند خیالی سے رشک کا خاتمہ کر دیا ہم بھی یہیں سلسلہ قلم ختم کرتے ہیں۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے   سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

پرستارِ غالبؔ

ظہیر علوی